کرناٹک کی ادبی شخصیات

مصنف

محمد خورشید عالم ندوی

کرناٹک کی ادبی شخصیات

مصنف

محمد خورشید عالم ندوی

کرناٹک کی ادبی شخصیات

مصنف

محمد خورشید عالم ندوی



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/99روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1850

Karnataka Ki Adabi Shakhsiyat

By: Mohd. Khurshid Alam Nadvi

ISBN :978-93-5160-080-0

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی110025 فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر:26109746 فیکس:26108159 ای-میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای-میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: بھارت گرافکس، C-83، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-1، نئی دہلی110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

عرضِ مصنف

حامداً ومصلیاً علی رسولہ الکریم.......................................اما بعد!

بفضل باری تعالیٰ یہاں کی ادبی شخصیات پر مضامین کا مجموعہ بعنوان 'کرناٹک کی ادبی شخصیات' تکمیل کے مرحلہ سے گزر کر آپ محبانِ اردو کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے، جس میں سات مرحومین شخصیات کے تعارفی خاکے اور ان کے مختلف کارناموں کا ذکر ہے۔ یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ صرف سات کیوں؟ دراصل ایک متعین مدت کے اندر جزوی اوقات میں صرف اتنی ہی شخصیات پر کام ممکن ہوسکا ہے۔ ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دائرہ کار و ہدایت کا پاس ولحاظ رکھنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا صرف شعرا، ادبا اور صحافی زمرے سے ان شخصیات کو چند الگ الگ صنف ادب کی نمائندہ شخصیات کے طور پر منتخب کیا ہے۔ ان کا انتخاب بے لاگ طور پر اردو کے تئیں گراں قدر خدمات اور فن میں مسلمہ حیثیت کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ یقیناً اس اہمیت و حیثیت کی حامل اور بھی شخصیات ہیں، جن میں سے بہت سی شخصیات کا تذکرہ اس سلسلے کی پہلی کڑی 'فخر کرناٹک شخصیات (مطبوعہ 2012 بزیر اہتمام کرناٹک اردو اکیڈی) میں آچکا ہے۔ پھر بھی راقم کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس نے اس کام کا حق ادا کردیا ہے۔ جن شخصیات کا احاطہ ہونے سے رہ گیا ہے، اسے قلتِ وقت کے عذر پر محمول کیا جائے۔

اس مجموعہ میں مضامین کی ترتیب اور شخصیتوں کی تقدیم وتاخیر میں ان کے زمانۂ وفات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔یعنی جن کی وفات پہلے واقع ہوئی ہے،ان کو پہلے جگہ دی گئی ہے،اسی ترتیب زمانی سے جن کی وفات بعد میں ہوئی ہے،ان کو بعد میں رکھا ہے۔اس میں ادب نواز احباب اور قاری کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے ۔لیے مختلف اصناف ادب سے وابستہ شخصیات کو اس صنف کی نمائندہ شخصیت کے طور پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

چنانچہ قدیم دینی اخبار ورسائل میں جنوب کے اولین دینی اخبار 'منشور محمدی' کے مدیر (1) قاسم غم صاحب مرحوم (بانی و مدیر اول)، اوران ہی کے ہم رکاب محمد شریف صاحب مرحوم (مدیر ثانی) کو متعارف کرایا ہے۔(2) دکنی زبان و ادب کے ترجمان اور ممتاز مزاحیہ شاعر سلیمان خطیب (3) خواتین کی نمائندگی کے لیے مشہور زمانہ افسانہ نگار ممتاز شیریں، (4) میدان صحافت سے مجاہد قلم، بابائے صحافت سید غوث محی الدین بانی و مدیر روز نامہ 'الکلام'، (5) فن شاعری میں یکتائے روزگار و ماہر عروض محمد یوسف نفیس بنگلوری، (6) نظم ونثر سے بلند پایہ ادیب، نقاد و مایہ ناز مدیر اور معروف غزل گو شاعر محمود ایاز، (7) اور اخیر میں غنائیہ نویس اورنرم لہجے کے منفرد نظم گو شاعر حمید الماس اس گلدستۂ ادب کا حصہ ہیں۔

ان شخصیات کے بارے میں معلومات اور مواد کے حصول میں ان کے وارثین، دیگر قریبی رشتے دار اور ہم عصر احباب سے مدد لی گئی ہے۔نیز جن پر کتابیں دستیاب ہیں، ان کتابوں اور قدیم و جدید جرائد ورسائل، اخبارات کے تراشے اور مقالوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ان کے حوالہ جات ہر مضمون کے اخیر میں دے دیے گئے ہیں۔یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ فرمان نبویؐ: اذکروا محاسن موتاکم۔(حدیث) کے مطابق شخصیات کی سیرت وشخصیت اوران کے کارناموں کو پیش کرنے میں غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں کو مناسب اسلوبِ بیان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ہر شخصیت کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے،جس سے مضامین قدرے طویل ہو گئے ہیں۔راقم کی یہ بھی سعی رہی ہے کہ شخصیات کو زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے عمدہ سے عمدہ انداز میں پیش کیا جائے۔اس معاملے میں کہاں تک کامیابی ہاتھ آئی ہے،اس بات کا فیصلہ قارئین کریں گے۔

امید ہے کہ ناچیز کی اس حقیر سعی اور پیشکش بھی پہلی کتاب 'فخر کرناٹک شخصیات' کی طرح قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی التماس ہے کہ اگر کہیں کوئی بھول چوک نظر آئے تو معاف کریں اور اس سے مطلع بھی کریں تا کہ آئندہ کی اشاعت میں اس کی اصلاح ہو سکے۔

اخیر میں اپنے ان دوست واحباب، اور محسنین کا بھی بے حد ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں راست یا غیر راست طور پر تعاون کیا۔ اس موقع پر گرامی قدر جناب ڈاکٹر ظہیر احمد باقوی کا بطور خاص احسان مند ہوں، جنھوں نے اس پورے مرحلہ میں نہ صرف سرپرستانہ توجہ فرمائی بلکہ حوصلہ افزائی کے ذریعہ عزم وارادے کو تقویت پہنچاتے رہے۔ جس سے کام تکمیل کو پہنچا۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے (آمین)

محمد خورشید عالم ندوی، بنگلور

محمد قاسم غم

دینِ اسلام اپنی طویل ترین تاریخ میں جن آزمائشوں اور ابتلا سے گزر کر پروان چڑھا ہے، تاریخ کے صفحات گواہ ہیں۔ان آزمائشوں میں وقت بہ وقت الحادی تنظیموں، مشنریوں کا سر اٹھانا اور اپنے ناپاک عزائم کے تحت مسلمانوں کے دین وعقیدہ پر ڈاکہ ڈالنا، ان کی مختلف کوششوں کا ایک حصہ رہا ہے۔انہی میں عیسائی مشنری کا وجود بھی ہے، جس نے بھولے منش لوگوں کو اپنے دامِ فریب میں لینے کے مختلف حربے اور تدبیریں اپناتی آرہی ہے۔

ہندستانی تاریخ کے تناظر میں خصوصاً غدر 1857 کے بعد اس پہلو پر نظر ڈالیں تو مؤرخین کے مطابق انگریزوں کے برسرِعروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا۔عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعے پر حملے شروع کردیے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکران پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون وتمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔

انیسویں صدی عیسوی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خانوادہ میں دو نئے مجتہد پیدا ہوئے۔مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی (1243ھ) اور مولانا عبدالحئی صاحب۔ان دو بزرگوں کے چشمۂ فیض سے ایک سے ایک جیالے تیار ہوئے، ان سے پورے برصغیر میں دین کا بول بالا ہوا۔ان بزرگانِ دین نے اسلام مخالف فتنوں اور خطرات کاڈٹ کر مقابلہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔

اللہ نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مولانا رحمت اللہ صاحب (کیرانوی)، اوران کے شاگرد رشید علامہ قاری ضیاء الدین محمد (ویلوری) ڈاکٹر وزیر خاں (آگرہ) اوراس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب (نانوتوی)، مولانا رحم علی صاحب (منگلوری) مولانا عنایت رسول صاحب (چریا کوٹی) مولانا سید محمد علی صاحب (مونگیری) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ جیسے اشخاص پیدا کیے۔ جنھوں نےعیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود ردعیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ کون باور کرسکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا، جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود ان ہی کی تصانیف سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابلِ شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا۔

غرض اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عیسائی تبلیغ اور آریائی حملوں کے مقابلہ کے لیے معسکر بنگلور میں سرقاضی حسن شریف عرف شاہ علی کی قیادت میں دینی غیرت وحمیت سے سرشار ایک جمعیت ابھری جس کے چار رکن رکین تھے اور سب اپنی جگہ ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت حسن شریف عرف شاہ علی کے ساتھ اُن کے تمام رشتہ دار تھے، جن سے جماعت قاضی محلہ تشکیل پائی تھی۔ وہ مسجد قاضی محلہ کے بانی بھی تھے۔

جناب محمد معروف صاحب بانی جامع معروف لال مسجد، جن کی زیر قیادت تمام گاؤقصاب صاحبان کی جماعت تھی۔ جناب کوٹے حیدر صاحب معسکر بنگلور کے لبابین جماعت کی قیادت کررہے تھے۔ اور جناب مولوی میر محی الدین صاحب، جن کی زیر قیادت معسکر بنگلور کی مسجد بیوپاریا سے جڑے احباب تھے۔ آپ اوپی ایچ روڈ پر واقع مسجد بیوپاریا کے بانی اور کئی کتب کے مصنف تھے۔ قطب ویلور کے خاص مریدین میں تھے۔ یہ جمعیت اپنے طور پر عیسائی مشنری کے حملوں کی مقدور بھر مدافعت کررہی تھی۔

یہ حالات و واقعات انیسویں صدی کے نصف زمانہ سے اواخر تک سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی ماقبل صدی کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ان حالات کا سرا انھیں سے جڑا ملتا ہے۔ اس دور میں جو فتنے اٹھے تھے، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس کا منحوس سایہ بعد کی صدیوں تک باقی رہا۔ تاہم اس دور میں بھی کا نٹے کا مقابلہ رہا۔ اس زمانہ میں بھی شاہ صاحب کے افراد خاندان نے نمایاں کارنامے انجام دیے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ نیز اس زمانہ میں بنگلور میں بھی حامیانِ اسلام اور جانباز سپاہیوں کا کوئی کال نہیں تھا۔

غرض اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب دلی میں تیموریوں کا چراغ گل ہورہا تھا، رشد و ہدایت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا، جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا۔ اور دلوں میں علم وفن کی خدمت کا نیا ولولہ پیدا ہوا۔ دلی کے خانوادوں میں اس وقت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1703-1762) کے گھرانے سے شاہ عبدالعزیز (1745-1823) اور ان کے بھائیوں شاہ عبدالقادر (1343ھ) شاہ رفیع الدین صاحب (1249ھ) وشاہ عبدالغنی پھر ان کے اخلاف میں شاہ محمد اسحاق (1262ھ) سے ایک نئی رونق پیدا ہوئی۔ اور وہ وقت آیا کہ ہندوستان میں اسلام کا چہرہ ان تمام بدعات وخرافات کے داغ سے پاک وصاف ہوا، جو جہالت اور غیر قوموں کے میل ملاپ سے پیدا ہو گیا تھا۔

اسی پس منظر میں بنگلور میں جو حالات پیدا ہوئے، اس کا مقابلہ کرنے والے بھی تھے۔ انہی مردان باصفا اور مردمومن میں محمد قاسم المتخلص بہ غم دشاد مدیر قاسم الاخبار تھے، جن کا تعارف درج ذیل شعر میں ملتا ہے:

آب ہے گنگ وجمن میں موجزن شمشیر کا
سرزمین ہند ہے یارب چمن شمشیر کا
غم ہوں میں سیف اللسان فیض جناب جذب سے
کام کرتا ہے جو میرا ہر سخن شمشیر کا

انھوں نے عیسائی مشنری کے بڑھتے قدم اور صحافت کے توسط سے دین اسلام پر یلغار کو بھانپ لیا تھا۔ مشنری کا اخبار جو آگ اگل رہے تھے، دین اسلام پر رکیک حملے اور عیسیٰ علیہ السلام

کی الوہیت کے ثبوت و حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نفی میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر رہے تھے، بھولے بھالے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کر کے انھیں تذبذب کا شکار بنا رہا تھا۔ مشنری اخبار کی اس زہر افشانی کو دیکھ کر ان کی غیرت ایمانی جوش میں آئی۔ انھوں نے اسی کی زبان اور وہی ہتھیار اپنا کر ترکی بہ ترکی جواب دینے کا عزم کیا اور منشور محمدی اخبار نکالا، جو قیام بنگلور کے بعد شائع ہونے والے اخبارات کی صف میں تیسرا اور دینی اخبار ہونے کے اعتبار سے پہلا اخبار مانا گیا ہے۔ منشور محمدی کا اولین نمبر بطور ضمیمہ' قاسم الاخبار 20 / جمادی الثانی 1289ھ مطابق 25 / اگست 1872 کو چامراج پریس واقع معسکر بنگلور سے شائع ہوا۔

بانی اخبار محمد قاسم، انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام غلام حسین (آرکاٹ) تھا۔ اپنے دور کے نامی گرامی شاعر وادیب و فن شاعری کے استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ شاد و غم تخلص کرتے تھے۔ میر اکرم علی خاں جذب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ محمد غوث عرف بابامیاں (1907 - 1831) قاسم کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ بھی شاعر تھے۔ جادو تخلص تھا۔ کلام جادو کے نام سے ان کا دیوان 1906 میں شائع ہوا ہے۔ قاسم صاحب کی دو اولاد تھیں۔ غلام محمد شریف (متوفی 1903) اور ایک لڑکی تھی۔

قاسم صاحب کے سر اس بات کا سہرا جاتا ہے کہ انھوں نے 'بزم غم' قائم کر کے شعرا و ادبا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ تاکہ انھیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور منظر عام پر لانے کا موقع ملے۔

انھوں نے بعد میں ایک اور اخبار' قاسم الاخبار' نکالا۔ بقول محمود خاں محمود یہ بنگلور میں اردو کا اولین اخبار تھا، جو 1861 مطابق ماہ محرم 1277ھ میں' بزم غم' کے پلیٹ فارم سے جاری ہوا۔ یہ ہفت روزہ اخبار بڑی تقطیع کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر صفحہ میں تین کالم، اور ہر کالم میں کم و بیش تیس سطریں ہوتی تھیں۔ اردو رسائل و اخبارات سے مفید علمی مضامین نقل کیے جاتے تھے۔ ہند و بیرون ہند کی مختصر خبریں انگریزی اخبارات سے ترجمہ کر کے شائع ہوتی تھیں۔ ایک اداریہ اور نامہ نگاروں کے مضامین و خطوط وغیرہ اس کے مشمولات ہوتے تھے۔ ملک بھر میں اس اخبار کی دھوم تھی۔ غم کے سانحۂ ارتحال 1309ھ مطابق 1891 تک اس کی 32 / جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

اخبارات کی صف میں منشور محمدی اشاعت کی غرض وغایت اور مشن کے اعتبار سے بالکل یکتا اخبار تھا۔ زرد صحافت سے کوسوں دور اس کا مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ اور دین اسلام کی حقانیت کو پیش کرنا تھا۔ منشور محمدی کی اشاعت وقت کا اہم ترین تقاضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی فریضہ بن گیا تھا۔ اس کی اشاعت کے پیچھے ایک خاص دینی جذبہ کارفرما تھا جسے 'جہاد بالقلم' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس امر کو اس قدر سنجیدگی سے لیا گیا تھا کہ سید ابوالمنصور صاحب جو اہل کتاب سے مناظرہ کرنے میں ماہر تھے، اپنے ایک وعظ میں آیت کریمہ 'یاایھاالذین آمنوا ادخلوفی السلم کافۃ ' کی تشریح وتوضیح کے ضمن میں مسلمانوں پر دیگر فرائض کی مواجبت کے ساتھ اس بات کو بھی فرض قرار دیا تھا کہ وہ خدا اور رسول کے نام کی حمایت میں کھڑے ہوں، قرآن وحدیث کی روشنی میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح نماز میں بعض ارکان ترک کر دینا نماز کو باطل کر دیتا ہے اسی طرح یہاں بھی غور کرنا چاہیے کہ جو شخص خدا اور سول کی حمایت سے غرض نہ رکھے، وہ پورا پورا مسلمان کیوں کر ہوا۔ کیونکہ ایمان کا سارا دارومدار تو اسی پر ہے کہ ہم خدا اور رسول کے واسطے غیرت مند نہیں ہیں، اس کی کوئی عبادت خدا کے واسطے نہیں ہے، وہ پورا پورا اسلام میں داخل نہ ہوا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث کے حوالے کی روشنی میں مزید لکھتے ہیں کہ اس کے باپ کو اگر کوئی سخت برا بھلا کہے یا اس کے بیٹے پر کوئی جھوٹی تہمت دھرے تو کیا یہ گوارا کر جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اور یہاں رسول اکرمؐ کے نام کی سر بازار اہانت ہے اور سیکڑوں ہزاروں رسالے اسلام کے ردّ میں تصنیف کیے جاتے ہیں، کیا مسلمانوں کو یہ غیرت کا مقام نہیں ہے کہ دنیا کے سینکڑوں جھگڑے اپنے سر لیتے ہیں، اور جان و مال فضول کاموں میں صرف کر دیتے ہیں، مگر خدا اور رسول کی حمایت میں ان کی ہمت بالکل پست ہے۔ (أخذته العزة بالاثم ثم فحسبه جهنم) اور نہیں جانتے کہ اگر اس غفلت میں ساری عمر رہے تو بھی کب تک؟۔ آخر ایک دن خدا اور رسول کے پاس جانا ضرور ہے۔ ایمانداروں کی پہچان جو خدا نے اپنے کلام میں بتلائی ہے وہ یہی ہے جو

حامیانِ اسلام کے سوا کسی میں نہیں۔

(بالاختصار، بحوالہ منشورِ محمدی شمارہ نمبر 5 رجلد 2، مطبوعہ 17 رصفر 1290ھ مطابق 1873)

اخبار بارہ صفحات کی بڑی تقطیع پر مشتمل تھا۔ مذہبی مضامین اور مناظروں بالخصوص دس یا گیارہ صفحات اپنے حریف اخبار 'شمس الاخبار' (لکھنؤ) کے مضامین کی مخالفت کے لیے وقف ہوتے تھے۔ اور ایک دو صفحات میں مختصر اہم خبریں انگریزی اردو اخبارات سے لی جاتی تھیں۔ منشورِ محمدی اپنے مخصوص انداز اور مشن کو لے کر ہندوستان بھر میں اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا تھا۔ شمالی ہند میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ بڑے بڑے لوگوں تک اس کی پہنچ تھی۔

حبیب النسا بیگم اپنی تصنیف میں صابری صاحب کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ ان کے والد نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے کتب خانہ میں اس اخبار کا 1880 سے 1885 تک کا مکمل فائل دیکھا تھا۔ یہی وہ اخبار تھا جس نے پہلے پہل شمالی ہند کو میسور کے ادب سے روشناس کرایا تھا۔

منشورِ محمدی کے مشمولات کی تفصیل میں جانے سے قبل اخبار کا منظوم ابتدائیہ (تمہید) جو سرورق پر ہوتا تھا، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تمہید اس کی اشاعت کی غرض و غایت نیز مخالف اخبار کے ناپاک عزائم اور اس کے پیچھے کارفرما عوامل کا پردہ چاک کرتا ہے نیز دینِ حق کی دعوت بھی دیتا ہے۔

ملاحظہ ہو تمہیدی مثنوی شمارہ نمبر 12، جلد 1 سے:

اللہ رے اس کی کبریائی — ہے مور کو دعویٰ خدائی
اک پرچہ ہے امریکن مشن کا — پتا ہے شداد کے چمن کا
اہلِ اسلام کے جگر پر — ہر لفظ ہے اس کا نوکِ خنجر
توہینِ جنابِ سرورِ دین — چھپواتے ہیں اس میں بانیٔ کہن
مسترِ مسمور کا ہے کاغذ — مردِ مغرور کا ہے کاغذ
بدلے ہوئے دینِ احمدی کے — دو ایک ہیں پشتیبان اس کے
ہیں ان میں سے اک بڑے محرر — کلک ان کا ہے نوکِ تیغِ نادر

بندے کو خدا بنانے والے | برگشتہ رجب علی بچارے
حق پوچھو تو شمس بے ادب سے | اہل اسلام تاب میں تھے
سرکار فرنگ کی بدولت | آزادی دین کی ہے بشارت
آیا یہ خیال دل میں غم کے | منشور محمدی نکالے
تائید سے دینی بھائیوں کی | چمکائی ہے تیغ طبع اپنی
لکھے وہ جواب منصفانہ | واصف جن کا ہے اک زمانہ
کہتے ہیں جناب عیش سنیے | مضمون عمدہ جواب اچھے
اور لکھتے رہیں گے تا بہ محشر | انشاء اللہ اے برادر
وہ شمس ہے یہ ابر رحمت | جادو وہ ہے یہ ہے کرامت
نمرود وہ یہ خلیل یزداں | وہ نار یہ نور باغ رضواں
شاہنشاہ انبیا کا فرمان | تاج سر اصفیا کا فرمان
آئینۂ حق سے منہ نہ پھیرو | میزان خرد میں اس کو تولو
کھل جائے گا حال حق و باطل | صورت کی ہے آئینہ مقابل
عیسیٰ کی منادی بدزبانی | بتلاؤ کہاں ہے میری جانی
توہین نہیں ہے دین کی دعوت | ذات اشرف کی ہے شرافت
بے وجہ جو ہم کو چھیڑتے ہو | ہے زہر یہ چھیڑ چھاڑ سمجھو
کس پرچے میں دین عیسوی کی | توہین بتاؤ کس نے لکھی
اوروں سے نہیں ہے کام ہم کو | وہ ایک سے ہے کلام ہم کو
معذور رکھو مسیحی بھائی | کلمہ پڑھ ہو چکی لڑائی

شمس الاخبار کی آنحضورؐ کے متعلق نکتہ چینی اور منشور محمدی کا منہ توڑ جواب

شمس الاخبار: اہل اسلام محمد صاحب کو فخر الانبیاء افضل الموجودات تصور کرتے ہیں۔

منشور محمدی: تصور کیا تصدیق کرتے ہیں۔

شمس الاخبار: زیادہ تر دلیل اس امر میں پیش لاتے ہیں کہ خدا نے فرمایا:

لو لاک لما خلقت الا فلاک، یعنی اگر نہ ہوتا تو نہ پیدا کرتا میں زمین و آسمان کو۔

منشور محمدی: ہر کہ در مضمون ایں عبارت پاک شک آرد کافر گردد آئندہ از تفصیل مضمونش واضح خواہد شد زیادہ تر کمتر دلیل کیا سرور عالم کے افضل الموجودات ہونے کے دلائل تو یہ میں سے یہ بھی ایک قوی دلیل ہے۔

شمس الاخبار: اس بات کو ہم چند وجوہات سے بے بنیاد تصور کرتے ہیں۔

منشور محمدی: تمھارے سب وجوہات اس مقدمے میں نامعقول ہیں۔ کیونکہ مضمون حدیث قدسی کا کچھ اور ہے اور تم کچھ اور سمجھے ہو۔ چنانچہ آئندہ اس کا بیان ہوگا۔

شمس الاخبار: کہ یہ صرف ان کے مداحوں کے مبالغے ہیں۔ چنانچہ شاعروں کا دستور ہے کہ شعر کو مبالغوں سے رونق دیتے ہیں۔ تاکہ سامعین ان کو پسند کر کے دل لگا کر سنیں۔

منشور محمدی: وہ حدیث قدسی ہے۔ اور رب العزت کا اپنے حبیب کو خبر دینا کچھ شاعروں کا مبالغہ نہیں یعنی کوئی اپنی طرف سے ایجاد کر کے افترا علی اللہ نہیں کیا ہے۔ جو شخص یہ بات کہے گا، اس کو ثابت کرنے کے قاعدے سے ثابت کرنا پڑے گا، نہیں تو جہنم کا راستہ لینا ہوگا۔ کس کو طاقت ہے اس کو شعری مبالغہ سمجھے۔ کیا منکر لوگ اس کو شاعروں کا سا مبالغہ سمجھنے سے ویسے ہی ہو جاتے ہیں؟۔ کبھی نہیں۔ آدمی جیسا دعویٰ کرتا ہے، ویسا ہی ثبوت کو بھی پہنچنا چاہیے۔ اس مبارک کلام میں اصل کیا ہے، اس اصل میں مبالغہ کہہ کر رونق کیا دیے ہیں کہ سامعین اس کو پسند کر کے دل لگا کر سنتے ہیں۔ وہ ایک اخبار الٰہی نہ مبالغہ شاعری، ہاں یہ بات دریافت کیا چاہیے کہ اس کا مضمون کیا ہے اور سرور عالم اس کے مصداق ہوئے یا نہیں۔ (اقتباس مناظرہ بحوالہ شمارہ 12 جلد 1 صفحہ 9-8 مطبوعہ 13 شوال 1289)

☆ دین اسلام پر شمس الاخبار کی ریشہ دوانی اور منشور محمدی کا دنداں شکن جواب

شمس الاخبار: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو ایک صدی کے عرصے میں یہ مذہب (عیسائیت) سب قوموں کو اپنے قبضے میں لائے گا۔

منشور محمدی: یہ مذہب سب قوموں کو اپنے قبضے میں لانے کے واسطے دو ایک صدی کی کیا سبب دیر ہے۔ بلکہ یہ بات لازم تھی کہ ہر وقت ہر قوم کے ہر فرد کو اپنے قبضے میں لے لے۔ اور عیسائی

بنالے۔ معلوم ہوا کہ بقول تمھارے ہندوؤں کے دین کے جیسا کمزور دین ہے۔

شمس الاخبار: آفتاب کے سامنے آسمان کے سب ستارے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔

منشور محمدی: جب آفتاب ڈوبا تو سب ستارے روشن نظر آتے ہیں۔ تب آفتاب صاحب کدھر جاتے ہیں۔ جب تم باطل مذہبوں کو ستاروں سے جو روشن استعارہ کیے تو تمھارا آفتاب کون سے بطلان کے درجے میں رہے گا ذرا دیکھیے۔ وہ تو 'ظلمات بعضها فوق بعض' ہے اور برعکس نہند نام زنگی کافور ہے۔

شمس الاخبار: اور مسیحی مذہب کے سامنے جتنے اور مذہب ہیں، سب کے سب غائب ہو جائیں گے۔

منشور محمدی: جب غائب ہو جائیں گے تب دیکھ لیں گے۔ اب تو مقابلہ کر رہے ہیں۔ غائب نہیں ہیں۔ اب کی بولو تب کی تب دیکھ لیں گے۔ اب کی تب بھی ہو گی۔

شمس الاخبار: کوئی دوسرا دین کلی نہیں ہے۔

منشور محمدی: ہاں آپ کا دین کلی ہے۔ مگر ضلالت کی دنیا کی ساری ضلالتیں سب اس کے افراد اور جزئیات۔

شمس الاخبار: کوئی دوسرا دین دنیا میں ترقی نہیں پا سکتا۔

منشور محمدی: تمھارا دین کے ترقی پانے کی یہی وجہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ اللہ کا نام جانے والا ہے۔ مخلوق کا نام بلند ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس کا ظہور دیکھ رہے ہیں کہ لوگ خدائے وحدہ لاشریک کو چھوڑ کر غلام کے بندے ہو رہے ہیں۔

شمس الاخبار: کوئی دوسرا دین سب قوموں کے واسطے موافقت اور مناسبت نہیں رکھتا ہے۔

منشور محمدی: ہاں! دین عیسوی بت پرستوں سے بڑی موافقت اور مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی مخلوق پرستی ہے یہاں بھی مخلوق پرستی۔

شمس الاخبار: اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا نے اس مذہب کو بنایا۔

منشور محمدی: سب مذہبوں کو کیا باطل کیا حق اللہ ہی نے بنایا۔ عیسویت کی کیا خصوصیت؟۔

لكل أمة جعلنا منسكاً هم ناسكوه.(سورہ حج، آیت67)

شمس الاخبار: اور یہ مذہب تمام روئے زمین پر پھیل جائے گا۔

منشور محمدی: تب قیامت بھی آجائے گی اور صور بھی پھونکا جاوے گا۔ اور اللہ اللہ بولنے والے باقی

ند ہے، سب غلام غلام بندہ بندہ مسیح مسیح پکارنے والے باقی رہیں گے۔ یا اللہ! تو وہ دن ہم پر نہ لا
(اقتباس بحوالہ شمارہ 6 رجلد 1، صفحہ 6)

غزل مسٹر امداد حسین تخلص بیمار عیسائی

مسیحا فلک پر ترا دبدبا ہے　　خدا کے مقابل ترا مرتبا ہے
عجب دونوں جانب سے ہے راز الفت　　تو پیارا خدا کا وہ عاشق ترا ہے
کہا تجھ کو خالق نے فرزند دل بند　　یہ ارض و سما تیرے باعث ہوا ہے
کہیں اوج تیرا ہے موسیٰ سے بڑھ کر　　کہ تو عرش پر حق سے گویا ہوا ہے
کسے رتبہ تیرے برابر کہ تو تو　　حبیب خدا سرور انبیا ہے
یہی اعتقاد اور مذہب ہے اپنا　　کہ عیسیٰ خدا ہے مسیحا خدا ہے
تو روح مقدس کو کر ہم پہ نازل　　گناہوں سے اب حال بدتر ہوا ہے
شفاعت کی ہے اس لیے تجھ سے امید　　گناہوں کے بدلے تو قرباں ہوا ہے
تیرا نور وہ ہے کہ نور علیٰ نور　　نہ خورشید گردوں میں ایسی ضیا ہے
ہو بیمار سے وصف کیوں کر تیرا　　ثنا خواں جل علی کبریا ہے

غزل مہتمم اخبار بہ جواب مسیحی مذکور

محمد شہنشاہ ہر دوسرا ہے　　حبیب خدا اشرف انبیاء ہے
وہی باعث ارض و سما ہے　　وہی قاسم رزق ہر دوسرا ہے
کہوں کیا خدا حال جذب محبت　　کہ آئینۂ معراج کا ماجرا ہے
خدا کے برابر ہے نام مبارک　　پھر عرش معلیٰ پہ لکھا ہوا ہے
قیامت کے دن ہم کو بخشانے والا　　خدا کی قسم مجتبیٰ مصطفیٰ ہے
شفیع دو عالم کی امت کا عالم　　مسیح ابن مریم کا ہم مرتبا ہے
جو دار مصیبت پہ چلا رہا تھا　　تماشا ہے وہ بھی خدا بن گیا ہے
کہاں ہے مسیحا کہاں عرش اعظم　　وہ چرخ چہارم پہ لٹکا ہوا ہے
محب ابن مریم کے لاریب ہیں　　دربار مشن کا جن پر کھلا ہے

یہ وہ خوبصورت ہیں کالے کرسچن مسیح ان کی خاطر ہی قرباں ہوا ہے
غراب سیاہان مشن کا غوغا لو شاہین منشور سے دب گیا ہے
مسیحا سے اے غم یہ صحت نہ ہوگی کہ بیماریٔ جہل بس لا دوا ہے

(بحوالہ شمارہ 18 ر جلد 2)

مراسلہ بنام مدیر سے ایک اقتباس جس میں منشور محمدی کی خدمات کی پذیرائی کی گئی ہے

"ذوالمجد والکرم جناب منشی محمد قاسم صاحب غم دام لطفکم

تسلیم کے بعد عرض خدمت ہے جب سے میں آپ کا اخبار گو ہر بار اسم بامسمیٰ منشور محمدی نام دیکھتا ہوں، طبیعت کو ایک ایسی فرحت حاصل ہوتی ہے کہ جس کا بیان میرے سے ہرگز نہیں۔ خدا آپ کو سلامت باکرامت رکھے کہ آپ نے یہ ایک ایسا کام کیا ہے کہ جس کی کفالت کے باعث آپ ہزار ہا ہزار تعریف وستائش کے مستحق ہیں۔ شمس الاخبار میں پادری رجب علی صاحب کی جو واہیات ہوتی ہیں، ان کا جواب تو جناب فضیلت مآب مولوی محمد حنیف صاحب ایڈیٹر اخبار منشور محمدی اس حسن وخوبی سے دیتے ہیں، کہ میری علم و دانست میں پادری صاحب کے دانت البتہ کھٹے ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کا لوہا ان کو ماننا پڑا ہے۔ پادری صاحب کی کمال عجز ولا جوابی کی یہی اک دلیل بس ہے کہ اجرائے اخبار منشور محمدی سے شمس الاخبار میں منشور محمدی کے جوابوں کی نسبت انھوں نے ایک بات بھی نہیں لکھی۔ کیوں کر لکھتے کہ وہ جواب کچھ ایسے ویسے نہیں ہیں۔ معقول طور سے پادری صاحب کے لفظ لفظ کی ان میں تردید ہوتی ہے۔ پھر جناب فاضل عدیم المثال مولوی چراغ علی صاحب کے جوابات دنداں شکن کا کیا پوچھنا چاہیے کہ ان میں رجب علی صاحب کی تحریروں کی تردید تو بہ دلائل عقلی ونقلی خوب طور سے ہوا کرتی ہے۔ میرے نزدیک جناب مولوی صاحب ممدوح کی تحریریں بے شک وشبہ رجب علی صاحب کے جگر پر نشتر کا کام کرتی ہیں۔ عالی مناقب فضیلت دستگاہ فاضل سعید جناب مولوی مرزا موحد کے ان دسوں سوالوں کو میں نے دیکھا۔ کیا معنیٰ کہ کوئی دیسی عیسائی ان سوالوں کا جواب دے اور معرکۂ مناظرہ میں مرزا صاحب موصوف کے حالات سے بندہ چنداں واقف نہیں۔ مگر ان کی

تحریر سے ایسا پایا جاتا ہے کہ آج ہندستان میں وہ اپنا عدیل وسہیم نہیں رکھتے۔"

اخبار سے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، محض نمونے کے طور پر ہیں۔ اور مناظرہ و بحث ومباحثہ کی محض ایک جھلک تھی۔ پورے اخبار کا بالاستیعاب جائزہ لیں تو بے شمار ایسے دین و مذہب اور عقیدہ کے علاوہ دیگر شعبہ حیات سے متعلق امور پر شمس الاخبار و دیگر مشنری اخبار کے اشکالات اور موشگافیاں ملتی ہیں، جس کا تریاق منشور محمدی نے بڑی دانشمندی اور حکمت و مصلحت پسندی سے پیش کیا ہے۔ ان اقتباسات سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اشکال کا جواب دینے میں عزت نفس کا خیال نیز بے جا باتوں سے گریز ملتا ہے۔ نفس موضوع سے بحث و تکرار اور دلائل کی روشنی میں اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی کئی ایسے مضامین و وعظ دیگر مصلحین و مناظرین کے ملتے ہیں جس میں انھوں نے اپنی بات خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کے علاوہ کلمہ پڑھنے کی ترغیب کا اہتمام کیا ہے۔ اس زمانے کے اردو ادب اور اسلوب نگارش کا نمونہ بھی ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس میں مختلف عیسائیوں جیسے منشی چمن لال اور امداد حسین بیمار عیسائی کو نظم، عمر خان میسوری، تحصیل، موحد نے نظم میں ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔

منشور محمدی شمس الاخبار کے مضامین کے علاوہ لدھیانہ کے مشنری اخبار بنام 'نور افشاں' کے اعتراضات کے جواب بھی شائع کرتا تھا۔ مناظرے اور شعر و شاعری کے بہترے واقعات کی روداد ملتی ہیں۔

محمد قاسم صاحب کو اخبار کی مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ دیگر علمی موضوعات پر اردو دنیا کو تصنیفات کا تحفہ بھی دے سکیں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ایک ایڈیٹر نے میدان صحافت میں اپنا زور قلم بھی صرف کیا ہو اور دیگر علمی گوشوں پر توجہ دے کر تصنیفات کا انبار بھی لگایا ہو۔ لہٰذا محمد قاسم صاحب نے ہفت روزہ اخبار 'قاسم الاخبار' اور منشور محمدی، جسے بنگلور کا پہلا دینی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے، ان دونوں اخبار کے توسط سے جو صحافتی خدمات انجام دیں، اور اسلام کی سربلندی کے لیے انھوں نے صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہیں، وہی ان کی تالیفات اور گراں قدر تصنیفات کا درجہ رکھتی ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ صحافی کے لیے اخبار کے مضامین ہی اس کی تالیفات اور تصانیف ہوتی ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ منشور محمدی قاسم غم کی زیرادارت صرف تین سال رہا۔اس کے وجوہات خواہ کچھ بھی رہے ہوں۔غرض یہ کہ 26 جون 1873 کو منشی قاسم غم نے ایک مجلس بنام انجمن ادب اسلامی، بنگلور، قائم کی اور منشور محمدی کا حساب وکتاب وغیرہ اس کے سپرد کردیا۔پھر اس کا حق اشاعت بھی ابتدائی 1874 سے انجمن اسلامی سے خصوصاً اور جناب غم مہتمم قاسم الاخبار وانجمن اسلامی سے عموماً زمرہ احباب کے سپرد کردیا گیا۔جن میں محمد شریف ،عبدالحیٔ صاحب سبزواری، عبدالحق صاحب تحقیق، نسیم اور موحد کے نام بطور خاص آتے ہیں اور ان سب کا قلمی تعاون بھی حاصل تھا۔پھر محمد شریف صاحب ہی اس کے اصل مالک ہوئے، مطبع بحرالاسلام سے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔اس سلسلے کی تفصیلات قاسم غم صاحب کے تذکرہ کے مابعد ملاحظہ کریں۔

قاسم صاحب صحافی ہونے کے علاوہ قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ریاست میسور 19ویں صدی کے نصف آخر زمانہ تک شعراوادبا کی آماجگاہ تھی۔اس کا شہرہ ملک کے دور دراز خطوں تک تھا۔گلی گلی میں شعری محفلیں بجتی تھیں۔شمال کے مہمان شعرا بھی مدعو ہوتے تھے۔19ویں صدی کے نصف زمانہ میں مدراس بھی اردوادب کا گہوارہ رہا ہے۔شعرائے مدراس کا ہر ہفتے ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔جس میں نواب اکرام علی خاں بہادر جذب، رجا، ذکا، طلسم ہمت، میر سجاد حسین فیاض اور محمد قاسم غم اس میں شریک ہوتے تھے۔

قاسم صاحب نے بحیثیت شاعر اردو دنیا کو منظوم ادب کی شکل میں بیش بہا سرمایہ دیا ہے۔جس کی قدرے تفصیل حسب ذیل ہے۔

مثنوی غم: منظوم ادب میں 'مثنوی غم' ان کی جانب سے اردو دنیا کو ایک حسین تحفہ ہے۔اس کی تاریخ تصنیف 1269ھ مطابق 1853 مرقوم ہے۔محمد علی طلسم مدراسی نے اس مثنوی کا قطعۂ تاریخ اس طرح رقم کیا ہے:

لکھا جب غم نے یہ غم نامۂ تازہ غم کہنہ کیا نابود ہے ہے
دلِ غمگین کو تھی بس غم سے الفت کہا سنہ "نظم دردآلود ہے ہے"

ان کے علاوہ اس مثنوی کا قطعۂ تاریخ احمد حسین، المتخلص بہ ہنر اور محمد اسمٰعیل المتخلص بہ

مائل ولد حکیم چھابومیاں ساکن بنگلور نے بھی تحریر کیا تھا۔

اس مثنوی کی اہمیت وافادیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر یہ مثنوی دست برد زمانہ سے بچ نہ جاتی تو آج پوری ایک صدی کے بعد سعید کے حالات کا اہلِ ادب کو علم ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ چونکہ اس میں ریاست میسور کے ایک نہایت کم عمر شاعر کی سوانح محفوظ ہے۔ درج ذیل انتخاب بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

یاں سے اک واقعہ سناتا ہوں — آتشِ غم سے جی جلاتا ہوں
ایک گل روجواں سعیدالدین — تھا وطن اس کا بنگلور میں
صفحۂ روے او کتاب حسن — نقطہ ٔ خال انتخابِ حسن
چیں اس کی جبیں یہ ایسی تھی — رگِ گل برگِ گل پہ ہو جیسے
لیوے تار نگاہ سے جب کام — ڈال سے آہوئے حرم پہ دام
گردن اس کی تھی یا صراحی تھی — خون عشاق سے مدام بھری
انگلیاں راستی میں تیر کی طرح — نری پوچھو تو تھی خمیر کی طرح
پنجہ یاں تھے اس قدر نازک — ہوتے رنگیں جو چلتا وہ چابک
جب میں ایسے کے پاؤں کو دیکھوں — کیوں قیامت بپا نہ اس کو کہوں
تھا وہ محبوب نازنیں وحسیں — ہرطرح رشک مہوشاں چیں
باوجود ایسے حسن صورت کے — اس میں کیا کیا نہ خوب سیرت تھے
بحر ہمت کا بے بہادر تھا — کیا شجاعت تھی کیا بہادر تھا
کام تھا اس کو مال دینے سے — دل کو لوگوں کے مول لینے سے
زرفشانی میں پنجہ ابرکرم — ایک کی جائے دیوے پانچ درم
ہاتھ منہ سے گہر فشاں تھا وہ — واہ کیا حاتم زماں تھا وہ
نوجوانی میں ایک مجمع ِفضل — جانتا تھا علوم ِ عقل و نقل
خوش نویسی کے فن میں کامل تھا — خط خوباں تھا خط مشق ان کا
فارسی اور ہندی بھی اشعار — خوب کہتا تھا وہ سلیقہ شعار

قبلۂ معنوی جناب شاد رکھے ہر جام انھیں خدا آباد
لائے تشریف جب سوئے بنگلور رہتے تھے اس سے شاد اور مسرور
وہ بھی ہر طرح آپ پر تھا نثار رہتے تھے ایک جا سے لیل و نہار
روز و شب اس کی قدردانی تھی اس پر حضرت کی جانفشانی تھی
نقل کرتے ہیں اس سے وہ اکمل فارسی آری سی ایک غزل

غزل

اے کند غمزہ ات خدا بیمائی آفریدی تو دل ربا بیما
نشو و درجہا بقسمت کس ہچو مقراض لب کشا بیما
چوں نگیں نقشِ نام من بنشت آخر از فیض جبہہ سا بیما
از رخ آئینہ راجدا کنی تا کجا یار خود نما بیما
اے سعید ایں ماں کجا ماجد تا کنم طبع آزما بیما

ایک ہندی غزل سلیس اور صاف دیکھو ہے آفتاب سی شفاف
اس کو لاتا ہوں میں بقید قلم سن اے مرحبا کہو ہردم
ہے ہر اک بیت شاہ بیت یقیں مثلِ اشعار مصحفی و نکیں

غزل

رات زلفوں سے جی پریشاں ہے دن کو دل رخ سے اس کے حیراں ہے
اے جنوں ہاتھ کیجیو کوتاہ اب نہ داماں ہے نہ گریباں ہے
جان و دل سے اب کچھ امید نہیں یہ مسافر ہے اور وہ مہماں ہے
اشک و لختِ جگر نہ ہوں ضائع ایک لولو ہے ایک مرجاں ہے
کیا عجب ہے اگر جلے تاثیر آہِ عشاق برقِ سوزاں ہے
غم نہیں تجھ کو دوسرا میں سعید پشت ہاں تیرا شاہ مرداں ہے
ناگہاں از قضائے رب جلیل پئے دق سے ہوا وہ ماہ علیل

تھا دوشنبہ دمِ صلوٰۃ الفجر
باندھا رختِ سفر وہ شاہدِ دہر

رات چھبیسویں......
لے گئے جس میں روح اس کی ملک

وہ مہینہ تھا ماہ ذی الحجہ
سنہ بھی بارہ سے ساٹھ پر نوتھا

گنجِ خوبی کو زیرِ خاک کیا
اور گریباں صبر چاک کیا

گور میں جائے دینے کے ڈھیلے
دیتے مردم تھے آنکھ کے ڈھیلے

فاتحہ پڑھ کے چل دیے سارے
رہ میں کہتے ہوئے وہ بنجارے

ہائے کیسا جواں رعنا قد
سوگیاجابہ خواب گاہ لحد

کیسی صورت تھی کیا نشانی تھی
قطب الدین کی نشانی تھی

اس قمروش کے باپ کا ماتم
غم کو طاقت نہیں کرے جو رقم

کہتے تھے بار بار آہ پکار
اے مرے پیارے اے مرے دلدار

دے مرے دل کو آ ذری تسکین
ہے کدھر تو اے مرے سعید الدین

تو تو پندرھویں سال ہی بیٹا
خواب گاہِ لحد میں میں جا لیٹا

کب دِلاسے سے اس کو ہو آرام
جس کا مٹی میں چھپ گیا ہو نام

صبر ایسے سے کس روش ہو پدید
جس کا لٹ جائے دم میں باغِ امید

دیکھ بولیں گے اس کو صاحب دید
تم بھی تھا ایک آشنائے سعید

بیشک اس مہ پہ جاں نثاری تھی
بعد مرنے کے اس سے یاری کی

مت کہو اس کو مختصر ہے کتاب
ہیں یہ سب پارۂ دل بیتاب

غم سے خونِ جگر پیا ہوں میں
سہل اس کو نہیں لکھا ہوں میں

قدردانی سے اس کو دیکھو ضرور
ہے مری مثنوی چراغِ طور

دوستو ہے یہ شاعرانہ لاف
صاف پوچھو تو بولتا ہوں صاف

ایک کج مج زباں ہوں ہیچ مداں
کچھ نہیں جانتا ہوں ایں و آں

خیر ہو تو دعائے خیر کرد
شر کہیں ہو تو خیر سے بدلو

غم یہ تیرا نہیں ہے اچھا کام ملتجی تو ہوا ہے سوے انام
کر دعا ہاتھ اٹھا بہ درگہہِ حق دے گا سب تجھ کو قادر مطلق
یاالٰہی طفیل شاہِ اُمم یا الٰہی طفیلِ لوح و قلم
بخش دے تو سعید کو میرے کیا بڑی بات فضل سے تیرے
جاے دے اس کو باغِ جنت میں رکھ شگفتہ جوارِ رحمت میں

قاسم صاحب (مرحوم) کا ایک مستقل دیوان تھا، جو 'دیوانِ غم' سے موسوم تھا۔ لیکن مفقود بتایا جاتا ہے۔ البتہ ان کے کلام کا کچھ حصہ 'دیوان جادو' کے آغاز میں 'یادگارِ غم' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست میسور سے شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں اکثر جو اکبر کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہوتے تھے، ان میں بھی آپ کا کلام جا بجا ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے معاصر شاعر نسیم کا دیوان بھی شائع کیا۔

بنگلور کے یہ دبستان علم وادب اور ماہر سخن گراں بہا ادبی سرمایے اور صحافتی خدمات کے انمٹ نقوش چھوڑ کر 1309ھ مطابق 1891 میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ محمد عبداللہ حسین خلیل (1855-1933) جو نیلسندر بنگلور کے قاضی تھے۔ عمر عزیز کے کم وبیش پچاس برس بچوں کی تعلیم و تربیت میں صرف کی۔ آپ کی متعدد تالیفات وتصنیفات ہیں۔

انھوں نے قاسم صاحب کے قطعۂ تاریخ وفات لکھی ہے۔ جو اس طرح ہے۔ ملاحظہ کریں:

حضرت غم محمد قاسم کرد رحلت زدارِ مکر و فساد
مردِ مردم شناس شد ز جہاں طوطی ہند شد بخلد آباد
غیرت خند عسکری سخنش ہست دیوانش کوزۂ قناد
دیدم اندر جرائد اشعار گاہ غم بہ تخلص گہ شاؔد
سال فوتش خلیل کرد رقم شاد بادا بخلد دایم شاد

1309ھ

عاشق صادق جو ہیں لیتے ہیں دے نقد دل
کاغذِ دیوان غم عشق کا دفتر ہوا

دیتے ہیں جو دین کو اشاعت کر دیجیے ان کی کچھ حمایت
اک مرد متین باہنر نے یعنی کہ شریف نامور نے
منشور محمدی نکالا اخبار سمجھیے یا رسالا
اٹھارہ برس سے ہے یہ جاری کرتا ہے مخالفوں کی خواری

(بحوالہ: منشور محمدی نمبر 1 رجلد ر، بروز شنبہ 19 رشمارہ 5 رمحرم الحرام 1310ھ مطابق 1892)

بہر کیف منشور محمدی کا 1310ھ کا شمارہ ایک لمبے سکوت اور وقفے کے بعد شائع ہوا تھا۔اس کے وجوہات بھی وہی تھے، جو عام اردو اخبارات کے ہوتے ہیں۔یعنی مالی مشکلات ،خریداروں کی کمی،اور جو خریدار ہوئے تو وقت پر ادائیگی نہیں۔اس صورت حال نے اخبار کی کمر توڑ دی اور اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔منشور محمدی کو اپنے صحافتی سفر میں کئی بار ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔لیکن کیوں اور کیسے؟ تو اس کا جواب خود ایڈیٹر کی اس تحریر سے ملتا ہے،جس کا عنوان ہے'منشور محمدی کیوں موقوف ہوا؟'۔

''آج تک جتنے ہمدرد اس اخبار کے تھے، وہ تمام یہی پوچھتے رہے کہ منشور محمدی کیوں موقوف ہوا؟۔ہم نے بعض کو جواب دیا،اور بعض کو جواب تو دیا مگر تشفی بخش نہیں۔اور بعض صاحبوں کو جواب ہی نہیں دیا۔اس لیے کہ اگر حقیقت حال کا اظہار کرتے ہیں،تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہی معنی ہوں گے کہ کچھ دیجیے۔ان میں بعض وہ اصحاب تھے، جو قیمت تو برابر ادا کر دیتے ہیں،مگر ذرا دیر کے ساتھ۔اور بعض وہ صاحب ہیں، جو برابر پیشگی ادا کر دیتے ہیں۔اور تھوڑے وہ حضرات عالی ہمم ہیں، جو زر قیمت کے علاوہ زبان سے ،قلم سے،زر چندہ سے۔غرض جہاں تک ہو سکتا ہے ہر طرح کی اعانت کرتے ہیں۔اور منشور محمدی کی حالت یہ ہے کہ وہ ہرگز ہرگز زر قیمت کے علاوہ اور کسی قسم کی امداد گوارا نہیں کر سکتا۔ تین سال قبل منشور محمدی کے باقی داروں کا حساب بذریعۂ ضمیمہ چھاپ کر تمام مشتریوں کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔جس میں تین ہزار سے زائد روپیوں کا

قرض نام مقام کے ساتھ بتلایا گیا تھا۔ اور ہر ہر باقی دار مشتری کو ایک نہیں دو نہیں، بیسیوں خطوط سال بھر میں روانہ کیے۔ مگر بہت کم لوگوں نے کچھ عطا کیا اور باقی سنگ دل کانوں میں تیل ڈال کر خاموش بیٹھے رہے۔ جواب تک نہ دیا۔ آخر کاران کم بختوں کے جان کو روتے ہوئے اخبار تین ماہ تک بند کر دینا پڑا۔

اس کے سچے ہمدرد کیوں چپ رہتے۔ دوڑ پڑے۔ کوئی زر قیمت پیشگی روانہ کیا، اور کسی صاحب نے دوہری قیمت مرحمت فرمائی۔ اور بعض حضرات علاوہ قیمت واعانت کے منشور محمدی کی قیام دائمی کے لیے سو روپے بطور فنڈ دینے کے خواستگار ہوئے اور جنھوں نے دوہری قیمت دینے کے علاوہ اپنے اپنے احباب کو خریدار بنائے اور بعض زبان سے اور قلم سے جہاں تک ہوا، اعانت کرنے میں ساعی وسرگرم رہے۔ اخبار کے تئیں ہمدردی اور کمک صرف مقامی سطح پر ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں اخبار کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی اور دلی آرزو کا اظہار کیا گیا کہ منشور محمدی نہ صرف دوبارہ جاری ہو بلکہ ہمیشہ کے لیے جاری ہو۔ نمبر 1 رجلد 19 میں ملک بھر کے ایسے سینکڑوں افراد کے نام شائع کیے گئے ہیں، جو اس کے سچے اور مخلص ہمدرد تھے۔

غرضیکہ 1305ھ میں جلد 18 بڑی دھوم دھام سے دگر ما گری کے ساتھ اتمام کو پہنچا۔ اور دوسرا سال (1306ھ) ایسا منحوس تھا کہ وہ منشور محمدی کو پھر موقوف کیے بغیر تمام نہیں ہوا۔"

اس بار تقریباً منشور محمدی کو موقوفی کا گہن لگے ہوئے تین سال کا عرصہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ بادی النظر میں دوبارہ جاری ہونا محال نظر آنے لگا۔ اخبار کے مخلص قارئین اور سچے ہمدردوں کے دل میں یہ خیال ستانے لگا کہ آیا اخبار منشور محمدی پھر جاری ہو سکے گا یا نہیں۔

زمانہ گذرتا رہا اور اخبار کے چاہنے والے بڑی حسرت کے ساتھ دین متین کے ترجمان منشور محمدی کا صحافت کے افق پر واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔

بالآخر اللہ تعالیٰ نے غیب سے انتظام فرمایا کہ جناب مولوی حاجی یوسف صالح صاحب

محمد شریف

مدیر و مالک مطبع بحرالاسلام

محمد شریف صاحب (مرحوم) شاہ نور ریاست (نزد ہبلی) کے جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے جد اعلیٰ شیخ محمد امام شاہ نور ریاست کے جاگیرداروں میں تھے۔والد ماجد شیخ محمد عثمان سوداگر کے نام سے معروف تھے۔یہ خاندان شاہ نور سے تقریباً غدر کے موقع پر بنگلور منتقل ہوا تھا۔شریف صاحب کا شمار چار مینار مسجد (واقع نزد رسل مارکیٹ،شیواجی نگر چوک) کے بانیوں میں ہوتا ہے۔1888 مطابق 28رشعبان 1306 کو مسجد اہل حدیث معروف بہ چار مینار کا افتتاح عمل میں آیا۔دیگر حضرات متولیان میں جناب عبدالرزاق، جناب عبداللطیف، جناب امام شریف، اور جناب عبداللہ محمد جعفر کے نام آتے ہیں۔

منشور محمدی محمد شریف کی زیر ادارت:

اخبار 24رنومبر 1875 سے جلد 4رنمبر 23 منشور محمدی انجمن خواستگار ترقی طریقۂ محمدیہ کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔پھر اسے حتمی طور پر محمد شریف (متوفی 1894 مطابق 1312ھ) نے گود لے لیا، جسے انھوں نے مطبع بحرالاسلام سے شائع کرنا شروع کیا۔اس بات کے ثبوت میں اخبار کے صفحۂ اول پر شائع طویل مثنوی (بطور تمہید) کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اب سنئے جو عرض مدعا ہے   تائید کلام مصطفےٰ ہے

اسلام کو دیجیے ترقی   اللہ سے لیجیے ترقی

دیتے ہیں جو دین کو اشاعت　کردیجیے ان کی کچھ حمایت
اک مرد متین باہنر نے　یعنی کہ شریف نامور نے
منشور محمدی نکالا　اخبار سمجھیے یا رسالا
اٹھارہ برس سے ہے یہ جاری　کرتا ہے مخالفوں کی خواری

(بحوالہ: منشور محمدی نمبر 1 رجلد رہ بروز شنبہ 19 رشارہ 5 رمحرم الحرام 1310ھ مطابق 1892)

بہر کیف منشور محمدی کا 1310ھ کا شمارہ ایک لمبے سکوت اور وقفے کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس کے وجوہات بھی وہی تھے، جو عام اردو اخبارات کے ہوتے ہیں۔ یعنی مالی مشکلات، خریداروں کی کمی، اور جو خریدار ہوئے تو وقت پر ادائیگی نہیں۔ اس صورت حال نے اخبار کی کمر توڑ دی اور اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ منشور محمدی کو اپنے صحافتی سفر میں کئی بار نا گفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن کیوں اور کیسے؟ تو اس کا جواب خود ایڈیٹر کی اس تحریر سے ملتا ہے، جس کا عنوان ہے 'منشور محمدی کیوں موقوف ہوا؟'۔

> ''آج تک جتنے ہمدرد اس اخبار کے تھے، وہ تمام یہی پوچھتے رہے کہ منشور محمدی کیوں موقوف ہوا؟۔ ہم نے بعض کو جواب دیا، اور بعض کو جواب تو دیا مگر تشفی بخش نہیں۔ اور بعض صاحبوں کو جواب ہی نہیں دیا۔ اس لیے کہ اگر حقیقت حال کا اظہار کرتے ہیں، تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہی معنی ہوں گے کہ کچھ دیجیے۔ ان میں بعض وہ اصحاب تھے، جو قیمت تو برابر ادا کردیتے ہیں، مگر ذرا دیر کے ساتھ۔ اور بعض وہ صاحب ہیں، جو برابر پیشگی ادا کردیتے ہیں۔ اور تھوڑے وہ حضرات عالی ہمم ہیں، جو زر قیمت کے علاوہ زبان سے، قلم سے، زر چندہ سے۔ غرض جہاں تک ہوسکتا ہے ہر طرح کی اعانت کرتے ہیں۔ اور منشور محمدی کی حالت یہ ہے کہ وہ ہرگز ہرگز زر قیمت کے علاوہ اور کسی قسم کی امداد گوارا نہیں کرسکتا۔
> تین سال قبل منشور محمدی کے باقی داروں کا حساب بذریعہ ضمیمہ چھاپ کر تمام مشتریوں کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ جس میں تین ہزار سے زائد روپیوں کا

قرض نام مقام کے ساتھ بتلایا گیا تھا۔ اور ہر ہر باقی دار مشتری کو ایک نہیں دو نہیں، بیسیوں خطوط سال بھر میں روانہ کیے۔ مگر بہت کم لوگوں نے کچھ عطا کیا اور باقی سنگ دل کانوں میں تیل ڈال کر خاموش بیٹھے رہے۔ جواب تک نہ دیا۔ آخر کاران کم بختوں کے جان کو روتے ہوئے اخبار تین ماہ تک بند کر دینا پڑا۔

اس کے سچے ہمدرد کیوں چپ رہتے۔ دوڑ پڑے۔ کوئی زر قیمت پیشگی روانہ کیا، اور کسی صاحب نے دوہری قیمت مرحمت فرمائی۔ اور بعض حضرات علاوہ قیمت واعانت کے منشور محمدی کی قیام دائمی کے لیے سو روپے بطور فنڈ دینے کے خواستگار ہوئے اور جنھوں نے دوہری قیمت دینے کے علاوہ اپنے احباب کو خریدار بنائے اور بعض زبان سے اور قلم سے جہاں تک ہوا، اعانت کرنے میں ساعی وسرگرم رہے۔' اخبار کے تئیں ہمدردی اور کسک صرف مقامی سطح پر ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں اخبار کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی اور دلی آرزو کا اظہار کیا گیا کہ منشور محمدی نہ صرف دوبارہ جاری ہو بلکہ ہمیشہ کے لیے جاری ہو۔ نمبر 1 رجلد 19 میں ملک بھر کے ایسے سینکڑوں افراد کے نام شائع کیے گئے ہیں، جو اس کے سچے اور مخلص ہمدرد تھے۔

غرضیکہ 1305ھ میں جلد 18 بڑی دھوم دھام سے وگرما گرمی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ اور دوسرا سال (1306ھ) ایسا منحوس تھا کہ وہ منشور محمدی کو پھر موقوف کیے بغیر تمام نہیں ہوا۔"

اس بار تقریباً منشور محمدی کو موقوفی کا گہن لگے ہوئے تین سال کا عرصہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ بادی النظر میں دوبارہ جاری ہونا محال نظر آنے لگا۔ اخبار کے مخلص قارئین اور سچے ہمدردوں کے دل میں یہ خیال ستانے لگا کہ آیا اخبار منشور محمدی پھر جاری ہو سکے گا یا نہیں۔

زمانہ گذرتا رہا اور اخبار کے چاہنے والے بڑی حسرت کے ساتھ دین متین کے ترجمان منشور محمدی کا صحافت کے افق پر واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔
بالآخر اللہ تعالیٰ نے غیب سے انتظام فرمایا کہ جناب مولوی حاجی یوسف صالح صاحب

(پونے) کو توفیق دی اور وہ امید کی کرن بن کر چالیس اخبار کی خریداری قبول کیے نیز دوسو روپے بطور اعانت ایک مشت دفتر منشور محمدی کو ارسال کیا۔ اس طرح خدا خدا کر کے ناامیدی کا کفر ٹوٹا اور اخبار کا دوبارہ اجرا 1310ھ میں عمل میں آیا۔

اس موقع پر اخبار کے نہایت ہمدرد و بہی خواہ اسلام و مسلمان جناب مولوی حاجی یوسف صاحب کا ارسال کردہ خط بنام ایڈیٹر منشور محمدی کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ خط کا اقتباس مختصراً حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از طرف حاجی یوسف بن صالح (پونے) بجناب مولانا محمد شریف صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

میں موریس سے واپس آیا تو آپ کے گرامی اخبار 'منشور محمدی' کی حالت دریافت کرنے سے کہ موقوف ہوگیا ہے، نہایت صدمہ ہوا۔ پیشتر جو تجویز سوچی گئی تھی کہ سو نفر سو سو روپے دیں اور اس سے کوئی ملکیت خریدی جاوے اور اس کی آمدنی سے یہ نامی اخبار جاری رہے لیکن وہ تدبیر بھی نہیں ہوئی۔ اس لیے میں نے یہ ارادہ مصمم کرلیا ہے کہ اپنی جائیداد سے ایک مکان جس کی آمدنی سالانہ دوسو روپے ہیں، محفل اسلام کو بطور وکالت لکھ دوں۔ اور وہ محفل اسلام آپ کو سالانہ دوسو روپے دیا کرے۔ بشرطیکہ آپ چالیس نسخہ منشور محمدی کے میں جس جگہ لکھوں، ارسال فرمایا کریں۔

اسی سلسلے میں ان کے دوسرے خط کا اقتباس:

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

دوسو روپے کے نوٹ ملفوف ہیں۔ آپ کام شروع کردیجیے۔ خداوند کریم فتح

دے، جس ملکیت کے واسطے میں نے لکھا تھا سو وہ کل یعنی 15/رجب 1309ھ کو محفل اسلام کے مکان میں بڑا جلسہ کرکے محفل مذکور کے حوالہ کردی۔ بایں شرط کہ تازیست میں اس کا متولی رہوں، اور جب تک منشور محمدی ردنصاریٰ میں جاری رہے، اس کی ملکیت کی آمدنی سے دو سو روپے دیے جائیں۔ وغیرہ وغیرہ

(بحوالہ: منشور محمدی نمبر1/جلد/19/صفحہ 56/شمارہ 5/محرم الحرام 1310ھ مطابق 1892)

اخبار کی اس زبوں حالی اور اس پر قارئین کی خاموشی و سردمہری، بجز چند قارئین کے ہمدردانہ التفات کا بغور جائزہ لیں اور موجودہ دور سے اس کا موازنہ کریں تو یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اردو کے تئیں اہل اردو کی سوچ وفکر میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اردو کے فروغ کے سلسلے میں اب بھی وہی کوتاہی اور بے رغبتی ہے۔ آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اب اردو قارئین میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اظہار تک کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ تو بھلا کسی اردو اخبار ورسائل کے بند ہونے پر ردعمل کے اظہار کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ اور ذاتی کوشش سے دم توڑ رہے اخبارات ورسائل کو تقویت پہنچانا اس سے بھی آگے کی چیز ہوگی۔ آج اردو کے جو بھی چراغ روشن ہیں، وہ کس کسمپرسی میں اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہیں، اردو سے سچا پیار اور ہمدردی رکھنے والا ایڈیٹر ہی بہتر جانتا ہے۔

تاہم منشور محمدی کو اس دور میں ملک بھر سے جو ہمدردی ملی اور اس کے احیا کی خواہش کا اظہار کیا گیا، اخبار کے بہی خواہوں اور ہمدردوں نے دامے درمے قدمے سخنے تعاون کیا، آج کل اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔

غرض اخبار کے ایڈیٹر محمد شریف صاحب نے اخبار کے نامساعد حالات میں معاملہ کو اللہ کے سپرد رکھا۔ کبھی اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوئے۔ آخری سانس تک اخبار کی بقا اور اس کے ترویج کی فکر میں لگے رہے۔ حتیٰ کہ جب ان کا انتقال 1894 میں ہوا تو اخبار کو ان کے فرزندوں نے سنبھالا اور اس کی اشاعت پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیا۔ اخبار کے جلد 21/میں شریف صاحب

کے انتقال کی خبر شائع ملی ہے اور نوٹ بھی درج ملا ہے کہ اخبار کا مالک اب فرزندان شریف ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد 20 تک کے شمارے شریف صاحب کی زیرادارت نکلے۔ ان کے فرزندان: محمد عبدالواحد، محمد عبدالحفیظ، محمد عبدالعظیم نے اس کی اشاعت کو اسی آب وتاب اور غرض و غایت کے ساتھ جاری رکھا۔تاہم فرزندان نے اس کی اشاعت کو کب تک جاری رکھا، وثوق کے ساتھ کسی قطعی سال کا حوالہ دینا مشکل ہے۔تاہم راقم الحروف نے منشور محمدی کا شمارہ نمبر 10 رجلد 25 رمطبوعہ سال 1317ھ مطابق 1899 دیکھا ہے، جن کے اوراق منتشر اور کیڑے مکوڑوں کے زیر تصرف ملے ہیں۔سلطنت خداداد کے مصنف محمود خاں محمود نے رسالہ 'کوثر' مطبوعہ ستمبر 1935 میں لکھا ہے کہ منشور محمدی تقریباً 54 سال تک شائع ہوتا رہا۔منشور محمدی کی کچھ جلدیں جو شریف صاحب اوران کے فرزندان کی زیرادارت شائع ہوئی ہیں، شریف صاحب مرحوم کے پڑپوتے جناب عبدالواحد صاحب ابن ابو حامد عبدالرحیم (سکریٹری مسلم لائبریری، بنگلور) کے پاس محفوظ ہیں۔جبکہ اس کے شروعاتی دور کی جلدیں مسلم لائبریری میں موجود ہیں۔

شریف صاحب کے حالات زندگی مزید تفصیل سے معلوم نہ ہو سکے۔ان کے علمی مرتبہ، اردو دوستی و دینی غیرت وحمیت کا اندازہ منشور محمدی کے ذریعہ کی گئی خدمات سے کیا جاسکتا ہے۔جب علمی کاوش تصنیف وتالیف کی شکل میں دیکھی جائے گی تو ان کے حق میں بھی یہی بات درست ٹھہرے گی کہ ایک عرصے تک انھوں نے منشور محمدی کو جاری رکھا اور اس کے ذریعے باطل کے بانگ دعووں کو استدلالی انداز اور دعوتی اسلوب میں غلط ثابت کرکے اسلام کی حقانیت کا پرچم بلند کرتے رہے۔ملک بھر میں منشور محمدی کو اسلام کا ترجمان اور مسلمانوں کے لیے خزانۂ علم و معرفت کا جو درجہ آپ کی کوششوں سے ملا تھا، نصاریٰ کے رد میں آپ کی یہ قلمی جدوجہد 'جہاد بالقلم' سے تعبیر کیے جانے کی مستحق ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ کی خدمت کا دائرہ صرف منشور محمدی ہی تک محدود تھا۔بلکہ مالک مطبع بحرالاسلام ہونے کی حیثیت سے بھی دینی ودعوتی کتابوں کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔متعدد کتابیں مطبع بحرالاسلام میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں۔ان

میں ایک کتاب عقیدۂ صابونی کا اردو سلیس ترجمہ بھی ہے۔ جو جمادی الاول 1302ھ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب مولوی حاجی حافظ وحید الزماں خاں کی ترجمہ کردہ ہے۔ اصل کتاب جلیل القدر عالم دین علامہ صابونی کی تصنیف ہے، جو افادہ عام کی غرض سے اردو میں منتقل کی گئی تھی۔ اسی طرح تقویۃ الایمان کی بابت بھی کہا جاتا ہے کہ اس پریس سے شائع ہوئی ہے۔ اس طرح اس مطبع نے دینی کتابوں کی نشر و اشاعت میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کا سہرا یقیناً محمد شریف صاحب (مرحوم) کے سر جاتا ہے۔

ماخذات:

☆ منشور محمدی شمارہ نمبر 5 / جلد 2، طبع از: مطبع فردوسی، بنگلور
☆ منشور محمدی نمبر 1 / جلد / 19 طبع از: مطبع بحر الاسلام، بنگلور
☆ ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما از: ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ولی اللہ
☆ جنوبی ہند کا بہترین ادب از: مجلس ادب بنگلور
☆ میسور میں اردو از: محمد سعید عبد الخالق (عثمانیہ)
☆ تاریخ عیدگاہ جدید (بہ متعلق اتحاد جماعت اربعہ) از: محمد صالح انصاری ایڈوکیٹ
☆ اعلامیہ بہ متعلق افتتاح مسجد چار مینار مرقومہ شعبان 1306ھ
☆ جناب عبد الواحد صاحب، پڑپوتہ جناب شریف صاحب (مرحوم) سکریٹری مسلم لائبریری، بنگلور

محمد یوسف نفیس بنگلوری

ممتاز شاعر وادیب مولوی محمد یوسف متخلص بہ نفیس بنگلوری جنوبی ہند میں صف اوّل کے اساتذہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے فن شاعری کو رطب و یابس اور لسانی نقص سے پاک کرنے، اس میں حسن اور نکھار لانے اور اس کے گیسوئے برہم کو درست کرنے میں اپنی ساری عمر کھپادی۔شاعری کو بطور فن اپنا کر اسے زبان وادب، فکروفن کے اس معیار پر لا کھڑا کیا، جو آنے والی نسل کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نفیس بنگلوری کلام کی نفاست، خیال کی نزاکت، زبان کی سلاست اور لسانی اصول وقواعد کو مکمل برتنے کے لیے مشہور مانے جاتے تھے۔زبان کی غیر معمولی غلطی تو کجا، معمولی لغزش بھی انھیں گوارا نہ تھا۔

نفیس بنگلوری نے ایسے دور میں آنکھیں کھولیں، جب یہاں شعروادب کے اُفق پر ایک سے ایک آفتاب و ماہتاب دنیائے ادب کو منوّر کررہے تھے اور ماضی کی ادبی تاریخ بھی اتنی ہی روشن اور تابناک تھی۔حضرت نفیس انیسویں صدی کے آخری دور میں پیدا ہوئے، جب انیسویں صدی کا سورج اپنی بساط لپیٹ رہا تھا۔وہ زمانہ 1899ء کا تھا۔شعروشاعری کے سازگار ماحول میں پروان چڑھے۔اردو ،فارسی اور عربی میں دسترس حاصل کی۔شعروادب کی آب وہوا آپ کے فکرواحساس کو راس آئی۔پھر فن شاعری اپنے تمام تر خصائص اور فکری اقدار کے ساتھ جزو زندگی بن کر رگ وپے میں اتر گیا۔

جب وہ اس فن سے آشنا ہوئے، تو شہر میں شعرا کی تعداد قابل لحاظ تھی، ماحول پُر کیف اور رونق افروز تھا، مشاعروں کا انعقاد، ادبی نشستوں اور اشعار کی گونج سے فضا معمور تھی۔ شہر مشاعروں کا گہوارہ تھا جس میں بیرونی شعرا بھی مدعو ہوتے تھے۔ وہ دور جن ادبا و شعرا کے ادبی کارناموں کا رہین منت رہا ہے، ان میں محمد عبدالرحمن (متوفی 1911)، منشی غلام محمود صفی (متوفی 1916) قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل (متوفی 1352ھ)، محمد عبدالباسط باسط (متوفی 1908) اکبر شریف تسکین (متوفی 1942)، مولانا عبدالخالق عرف امیر (متوفی 1916) حیدر شریف فہیم (متوفی 1926)، رقیہ بی کنیز (متوفی 1926) صفیہ بی حیا (متوفی 1928)، بتول بی (متوفی 1943)، سید شاہ درویش پیر قادری (متوفی 1923)، سلطان محمود خان سلطان (متوفی 1944)، محمد قاسم انصاری قسیم، مولوی عبدالوہاب مکی (متوفی 1923) محمد عبدالعلی فائق، حاجی عبدالجلیل اجمل، محمد عبدالرحمٰن سیفی، سالار خان مرعوب، منشی احمد اللہ منجے دیوانہ، سید ضامن ماہر، ولی احمد ولی، نصیر، عبدالسبحان ہوشیار، محمد عظیم الدین عظیم، جوہر، عبدالقادر طالب، عائشہ بیگم، رقیہ بیگم، آر عبدالقادر، حکیم بشیر احمد، سید عبدالروف سبزواری اثر، ٹی ایم عزیز اللہ، عزیز، زہیر عاقل شاہی، شاہ ابوالحسن ادیب (متوفی 1960)، عقیلہ بیگم، محمد سلیمان پرواز، محمد جعفر شریف خاکی، عبدالقدوس خلدی، محمود خاں محمود، مرزا نذیر حسین نذیر، سلیم علوی، الفت، گردش، مائل ٹمکوری و محمد عبدالرحمٰن برق کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض 1902 سے 1940 اور بعض زائد از نصف صدی تک یہاں آسمان ادب پر نجم و کواکب بن کر درخشاں رہے۔ حالانکہ بیسویں صدی کے اوائل زمانہ کو مؤرخین نے عموی طور پر اردو صحافت اور زبان و ادب کے زوال اور انگریزی تعلیم کے عروج کا دور بتایا ہے۔ اس کے باوجود اہل سخن کی اتنی بڑی تعداد یہاں تھی۔

اس جائزہ کے بعد اس سے متصل قبل کی صدی میں ادبی صورت حال کا جائزہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ دونوں صدی کا درست موازنہ کیا جا سکے۔

چنانچہ ڈاکٹر حبیب النسا بیگم رقم طراز ہیں کہ گذشتہ صدی کے نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں میں سے بعض ابھی موجود تھے، جن کے زور قلم کی دھاک خاص و عام کے دلوں پر نقش تھی۔ ان میں

شہاب، شوکت، رضا، کی، محمود وغیرہ میدان شاعری کے شہسوار تھے جن کی جولانی طبع کے نت نئے نظارے پیش نظر ہوتے رہتے تھے۔

بشمول چندان شعرا کے، جن کے اسماگرامی اوپر تذکرے میں آچکے ہیں، انیسویں صدی سے منسوب شعرا میں محمود خاں محمود نے رسالہ کوثر مطبوعہ 1935 میں شعرا کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ جن میں 40 شعرا کے نام ملتے ہیں۔ یہ فہرست اس نوٹ کے ساتھ ہے۔ 'بنگلور میں بہت سے نامی گرامی شعرا گزرے ہیں۔ ان میں جس قدر نام معلوم ہو سکے، اس کی فہرست ذیل میں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے شعرا کے نام ضبط تحریر میں نہیں آسکے۔ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت تحقیق کی شاعری نے بنگلور کو چار چاند لگادیے تھے۔ آپ ایک مستند جید فاضل، اور باکمال شاعر تھے۔ 'ترغیب' کے ایڈیٹر حضرت آرام اور 'مصلح' کے ایڈیٹر حضرت عبدالحئی صاحب سبزواری ان باکمال ادیبوں میں سے ہیں جن پر بنگلور کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

انیسویں صدی کے ادبی حالات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ بنگلور میں شعرا، ادبا اور اہل علم کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے، جس کے متعلق حضرت صابر مرحوم فرماتے ہیں:

سیر کرلیتا ہوں صابر رات بھر جنت کی میں
جب خیال آتا ہے مجھ کو خواب میں بنگلور کا

مرحومہ حبیب النسا بیگم نے اس دور میں شمال وجنوب کی ادبی سرگرمیوں کا موازنہ کرتے ہوئے تبصرہ کیا ہے کہ اس زمانے میں شمال میں غالب کے خطوط نے آسان وعام فہم زبان کو مقبول وخاص وعام بنادیا تھا۔ اور سرسید احمد نے دقیق سے دقیق مضامین کو سادہ اور دلکش طرز میں بیان کرکے اردو زبان کی صلاحیت وعلمی وسعت کا لوہا منوالیا تھا۔ لکھنؤ میں شعروسخن کی بساطیں بچھی ہوئی تھیں۔ تمام ہندوستان میں ناسخ وآتش کا طوطی بول رہا تھا۔ چھاپے خانے کے قیام اور اخبار نویسی کی توسیع نے شمال وجنوبی ہندوستان کو ایک کردیا تھا۔

چنانچہ ریاست میسور میں بھی شعروسخن کی محفلیں گرم ہوتیں، اور رندان لاابالی بڑے جوش وخروش سے ترنم ریز ہوتے، مطبعے قائم ہوتے۔ اخبارات اور رسائل نکلتے اور شعرائے میسور اپنے علم

اور قابلیت کے زعم میں لکھنؤ کے شعرا کی برابری کا دعویٰ کرتے۔ جیسا کہ ناصر نے اپنے دیوان میں لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

شاعران لکھنؤ کو رشک ہووے سربسر
ایسے ہیں طبع رسا بنگلور میں بھی آج
رتبہ یہ ہوا شعروسخن میں مجھے حاصل
ہیں ناسخ وآتش مرے گلشن کے عنادل

غرض انیسویں اور بیسویں صدی کے نصف دور کے درمیان ادبی جوش وخروش، گہما گہمی اور سرگرمیوں کا موازنہ نیز شمال سے اس کا تقابل اس نتیجے پر لے جاتا ہے کہ نفیس بنگلوری کو جہاں قابل ہم عصر شعرا اور اہلِ کمال سخنور ملے، وہیں ماقبل صدی کا عظیم ادبی سرمایہ، سازگار ماحول اور چوٹی کے شعرا کی تربیت ورہنمائی اس پر مستزاد، جس شہر کی گلی کوچوں میں اس قدر شعروسخن کے چرچے ہوں، وہاں نفیس جیسے باذوق اور زیرک طالبِ علم سخن کے لیے اپنے نفیس ذوق کی نشوونما میں کوئی دقت و پریشانی پیش نہیں آئی۔

لہٰذا حضرت نفیس نے جب خود کو دنیائے شعروسخن کے حوالے کیا تو انھوں نے اسے پورے فنی لوازمات اور لسانی جمالیات کے ساتھ برتنے کی بھی کوشش کی۔ الفاظ کی تراش وخراش، فصیح وغیر فصیح، ترک وقبول، تلفظ واملا، قافیہ کا استعمال، تذکیر وتانیث، واحد جمع، محاورے، 'نہ' اور 'نہیں' کا استعمال، مستثنیات ومتروکات یہ تمام پہلوان کے ذوق شاعری اور حصول فن کا ترجیحی حصہ رہی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت نفیس نے اہلِ کمال سے کسب فیض میں شمال وجنوب کی سرحدی حد بندیوں کا مطلقاً پروا کیے بغیر اپنے کلام کی اصلاح، زبان وادب کے فنی محاسن و جمالیات کی تہہ تک پہنچنے میں شمال کی فخر روزگار ہستیوں سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ شعرا اور جن احبابِ ادب سے قلمی روابط تھے، کی تعداد 26 تک پہنچتی ہے۔ جن کے نام حسب موقع آئندہ آئیں گے۔

نفیس بنگلوری اپنے اساتذہ سے مستقل استفسار واستفادہ اور سعی پیہم کے نتیجہ میں ایسے

پختہ زبان اور نازک خیال شاعر بن گئے، جن کی زبان صحیح و غلط کا معیار اور صحت و سقم کا میزان ثابت ہوئی، فکر کی بلندی، زبان کی پختگی، احساس کی نازکی ان کی شاعری کی شان بنی۔ ماہر اساتذہ کی اصلاح نے انھیں تراش کر ایک گوہر نایاب بنا دیا تھا۔

نفیس بنگلوری کو بحیثیت شاعر، ماہر عروض داں اور فکر و فن کے نوع بہ نوع جواہر کا معدن ثابت کرتے ہوئے اسماعیل تابش، بانی روزنامہ پاسبان کا تحریر کردہ مبسوط مقالہ بعنوان 'نفیس شاعر نازک خیال ہے کیسا' اس ضمن میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم ہم نے ان کے خیالات و تبصرے کے علاوہ دیگر ماہرین کے آراء بھی ذیل میں پیش کر دیے ہیں۔

''مرحوم (نفیس بنگلوری) قدیم مکتب فکر کی باقیات میں سے تھے۔ اگر چہ ادبی دنیا میں انھیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا، جس کے وہ مستحق تھے۔ تاہم وہ اتنے گمنام بھی نہیں تھے۔ شمال کے چند مخصوص اساتذہ سے ان کے بڑے گہرے مراسم رہے، اور وہ مسلسل خط و کتابت کے ذریعے زبان و ادب اور شعر و عروض کے مختلف پیچیدہ مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ نفیس کے پاس خط و کتابت کا ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جو اردو زبان و ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے۔ نفیس کو نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل، جانشین حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے حضرت ریاض، خیر آبادی، وسیم خیر آبادی، مرزا یگانہ چنگیزی، مولانا ناطق گلاٹھوی، قمر بدایونی، علامہ آرزو اور دیگر مشاہیر ادب سے تحریری تعلقات قائم رکھے تھے۔ ایک عرصہ تک آپ کا کلام شمال کے بعض ممتاز رسائل خصوصاً 'عالمگیر' لاہور میں خاص اہتمام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ آپ کے کلام کو وہی حیثیت اور وہی نمایاں جگہ دی جاتی تھی، جو دیگر اساتذۂ کرام کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر دانوں کے ایک مخصوص حلقہ میں خواہ وہ کتنا ہی مختصر اور محدود ہی کیوں نہ ہو، نفیس کو کیا مقام حاصل تھا، 1930 تا

1940 تک وہ اخبارات و رسائل میں کافی نمایاں نظر آتے رہے۔لیکن اس کے بعد ایسے بجھے کہ ان کا ادبی وجود و عدم دونوں برابر تھے۔کچھ ذاتی سانحات نے اور کچھ یاروں کی ناقدرشناسی نے نفیس کو زندگی ہی سے مایوس کردیا تھا۔وہ ایک غیور اور خود دار طبع انسان تھے۔انھوں نے شعر و سخن کی تمام سرگرمیوں اور سوسائٹی کی تمام دلچسپیوں کو چھوڑ کر گمنامی اور کنج عزلت اختیار کرلیا۔لیکن نفیس کی متجسس فکر و نظر کب خاموش بیٹھنے والی تھی۔انھوں نے مسلسل تحقیق و تجسس کے بعد زبان و عروض کے چند ایسے شہ پارے تیار کیے، جو ہمارے ادبی ذخیرہ کو مالا مال کر سکتے ہیں"۔

نفیس بحیثیت اہل زبان (مصنف)

حضرت نفیس نے کلام کے علاوہ کئی اور اہم تصنیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں۔جن میں انھوں نے مستند اور ناقابل تردید ذرائع سے معلومات حاصل کرکے زبان و ادب، محاورات دنترو کات کے بہت سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے، جو زبان و ادب کے طالب علم کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔خصوصاً 'استفسارات' بڑی دلچسپ کتاب ہے۔اس میں عروض، شاعری اور دیگر مسائل سے متعلق کوئی دیڑھ سو خطوط اور ان کے جوابات ہیں۔

جناب ڈاکٹر علی احمد جلیلی استفسارات کے متعلق لکھتے ہیں:

"نفیس بنگلوری میرے والد فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اصلاح کے لیے غزلوں کے ساتھ استفسارات کی فہرست بالالتزام بھیجتے تھے۔اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نفیس نے فن شعر سے متعلق اپنی تشنگی بجھانے کے واسطے کئی ایک اساتذۂ سخن سے ربط پیدا کیا تھا۔وہ بذریعہ تحریر ان سے جواب حاصل کرتے رہے۔ان استفسارات کے جوابات کو یکجا کرنے پر جو صورت گری ہوئی وہ 'استفسارات نفیس' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔"

استفسارات میں اساتذۂ سخن کے مکتوب میں جو طرز اصلاح و طریقۂ جواب ملحوظ ملتا

ہے،اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان اساتذۂ سخن میں سے بعض نے تو بڑی بے باکی اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی رائے کا دوٹوک اظہار کیا ہے۔اور بعض رائے دینے میں بہت محتاط رہے ہیں۔جواب میں کم سے کم الفاظ استعمال کیے ہیں۔ان کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک دو صورتوں میں خود استاد کے کسی شعر کے حسن وقبح یا وزن کے بارے میں شاگرد کا سوال ہے۔کچھ ایسے استفسارات بھی ہیں،جن میں کسی ایک ہمعصر استاد کے متعلق دوسرے استاد کی رائے دریافت کی گئی ہے۔ایسی سچویشن بھی ہیں،جہاں ایک ہی استفسار کئی اساتذہ سے کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر ان کے جوابات میں ہم آہنگی زیادہ ہے،اختلاف کم۔''

(خلاصہ یہ کہ)انہوں نے اپنے استفسارات کے ذریعے فن شعر کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں کامیابی حاصل کی،جس کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے استفسارات کی ادبی وفنی حیثیت اور اہمیت پر یوں مہر ثبت کیا ہے:

''یہ تالیف اپنے موضوع پر ماضی کے ورثہ کی امین ہے۔نکاتِ شاعری اور فن کا محاسبہ ہے۔یہ کتاب ایسا قیمتی مواد فراہم کرتی ہے،جو نہ صرف ادب کے طالب علم ہی کے لیے مفید ہے،ان بالغ نظر اہلِ دانش کے لیے بھی جنھیں اپنے ماضی کی اہم قدروں کو دیکھنے،سمجھنے اور پڑھنے کا شوق ہے۔''

حضرت نفیس کی اس تالیف کو ان کے فرزند سلیم مینائی نے ترتیب دی ہے جو 148 صفحات پر مبسوط ہے اور 1993 میں اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

افاداتِ نفیس

یہ کتاب دو اہم حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ اساتذۂ سخن کے مکتوبات کا احاطہ کرتا ہے ،جو حضرت نفیس بنگلوری کے نام ہیں۔اور دوسرا متروکات کا جو تصریحات کے عنوان سے ہے۔مرتب نے اس حصہ کو'عرضِ مرتب'میں متروکات کے باب میں اپنی نوعیت کا منفرد اضافہ

قرار دیا ہے۔ اخیر کا حصہ آپ کی وفات پر ملک کے معروف شعرا بشمول مقامی ادبا و مدیرانِ اخبارات و رسائل کے تعزیتی خطوط و قطعات تاریخ وفات پر مشتمل ہے۔ کتاب کرناٹک اردو اکادمی سے 1985 میں شائع ہوئی ہے۔

اصطلاحاتِ اردو

اصطلاحاتِ اردو نامی رسالے میں حضرت نفیس نے متعدد ایسے الفاظ جمع کیے ہیں، جو مختلف المعنی ہیں۔ اور سند میں حضرت جلیل ہی کا کلام پیش کیا گیا ہے۔

مُرتّب کتاب سلیم بینائی اس کتاب کے حرفِ آغاز میں کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ 'اس میں بعض مشترک لفظوں کے اصطلاحی معنی بتا کر حضرت جلیل کے شعر سند میں پیش کیے گیے ہیں۔ اردو شاعری میں فصاحت جنگ حضرت جلیل ایک مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ والد مرحوم نے ان کی شاگردی اختیار کی اور اس بات کا ذکر اپنے اشعار میں بھی کیا ہے ؎

خُم خانۂ جلیل میں ڈھلتی ہے جو نفیس
پی خود بھی جھک کے اور ہمیں بھی پلائے جا
نفیس استاد کا فیضان اکثر مجھ سے کہتا ہے
کہ میں تیرے لیے شیوہ بیانی لے کے آیا ہوں

اصطلاحاتِ اردو کی روشنی میں فارسی کے ان دو مصرعوں کو دیکھیے:

ع.....خبرے رسید امشب کہ نگار خواہد آمد
ع.....آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیاید

اس میں 'خبر' دو الگ معنی دیتی ہے۔ پہلے مصرع میں 'اطلاع' کے معنی میں مستعمل ہے، جبکہ دوسرے مصرع میں 'خبر' یقین کے معنی میں آیا ہے۔ اس طرح کتاب ہذا میں بے شمار مشترک معنی کے الفاظ پیش کیے گیے ہیں۔

بطورِ نمونہ چند الفاظ مع استدلال شعر ملاحظہ ہوں

ایسے بھی بہ معنی اس درجہ..... بدگماں ایسے بھی دنیا میں ہوا کرتے ہیں
اس نے رکھے ہیں نگہباں نگہبانوں پر

ایسے کچھ بہ معنی اس درجہ...... ایسے کچھ خستہ ہوئے تیر اتر کر دل میں
میں نے چاہا کہ نکالوں تو نکالے نہ گئے

ایسے میں بہ معنی اس وقت...... ساقی سے یہ کہدو کہ چلی باد بہار
ایسے میں کوئی دور بھی چل جائے تو اچھا

ایک بہ معنی ایسے............ صیاد کو ہے بلبل ناشاد کی تلاش
بلبل ہیں ایک ہم کہ ہے صیاد کی تلاش

ایک بہ معنی نئی............ ہر ادا میں ایک جدت ہر نگہ میں تازہ حسن
بن سنور کر آپ جب نکلے نیا عالم ہوا

ایک بہ معنی کسی............ تیرے انداز تجھ کو ایک دن قاتل بنائیں گے
ابھی سے ہر ادا تیری نرالی ہوتی جاتی ہے

یہ کتاب بھی 1986 میں اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

تصریحات اردو

اس میں مستعمل الفاظ کے بالمقابل متروک الفاظ جمع کیے گئے ہیں اور نفیس نے ہر متروک لفظ کی توجیہ خود حضرت ناطق سے حاصل کی ہے۔

حضرت مولانا ناطق گلاوٹھوی، استاذ مولوی یوسف نفیس، اپنے ایک مکتوب میں تصریحات اردو (مجموعہ متروک و مستعمل الفاظ) کی اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں، جو کسی ایک محل میں متروک ہیں، مگر دوسرے معنی میں فصیح۔ اس کی بھی میں نے تشریح کر دی ہے کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اساتذہ نے جن الفاظ کو کسی خاص معنی میں متروک گردانا ہے۔ انھیں پڑھ کر کم علم اور بے بہرہ لوگ اسے قطعی متروک سمجھ جاتے ہیں۔ اور اس سند سے دیگر اساتذہ پر بھی اعتراض کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ ان میں بہت الفاظ ایسے بھی ہیں، جنھیں میں نے متروک لکھ دیا۔ لیکن داغ و امیر کے وہاں وہ بہت ملتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ان کا استعمال بعد میں نہیں رہا۔ داغ و امیر کے وہاں انھیں قابل

اعتراض نہیں سمجھا جائے گا۔

موجودہ اساتذہ میں سے بھی جن صاحب کی تحقیق کہیں میری رائے کے خلاف ہو، یا خلاف رائے رکھتے ہوں ان کے لیے بھی میری رائے واجب العمل نہ ہوگی۔مگر بشرطیکہ وہ صاحب خود اہلِ تحقیق ہوں۔ میں نے کہیں کہیں مقامات ہند کا فرق لسانی بھی بتایا ہے، اس میں میرے نزدیک نہ اہلِ دہلی، اپنے محاورہ کے مطابق اہلِ لکھنؤ کو غلط ٹھہرا سکتے ہیں، نہ لکھنوی اہلِ ادب کو یہ حق حاصل ہے کہ دہلی والوں پر اپنی زبان کی سند لے کر اعتراض کریں کہ ان دونوں مقامات کو زبان کا مرکز مان لیا گیا ہے۔مگر میرے نزدیک صرف دہلی اور لکھنؤ ہی نہیں، بلکہ پورے ملک کا ہر اہلِ علم جو ادب نواز اور محتاط ہو، مستند سمجھا جائے گا جیسے کہ مولانا حالی پانی پتی، ومولانا شاد عظیم آبادی۔"

نمونہ:

آپ کو (متروک)......اپنے کو، اپنے آپ کو (مستعمل)......

بھی ہے اگر حسن بے نیازی تو اپنے کو خود ہی مٹانا پڑے گا (آرزو لکھنوی)

تصریح......صرف آپ کو اب فصحا نہیں بولتے، اور خود کو سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ اپنے کو بھی زیادہ نہیں بولا جاتا۔ البتہ اپنے آپ کو بالکل درست ہے۔

متاعِ ہنر:

یہ آپ کا مجموعۂ انتخابِ کلام ہے۔ جسے 1982 میں کرناٹک اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اس کے مرتب بھی سلیم مینائی ہیں۔ کتاب 64 صفحات پر مشتمل ہے۔

علمِ عروض عروض ہمیشہ حضرت نفیس کا ایک خاص شغل یا ایک Hobby رہی ہے۔ علمِ عروض پر حضرت فصاحت جنگ جلیل کے رسالے 'اردو کا عروض' پر نہ صرف مفید حواشی لکھے، بلکہ خود 'میزانِ سخن' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا ہے جس میں علمِ عروض کے اوزان وارکان اوران کے زحافات پر تفصیلی بحث کی ہے۔

مولوی محمد خان نے حضرت نفیس کی عروض پر مہارت و دسترس کا لوہا منوانے کا ایک واقعہ یوں نقل کیا ہے:

> ''چند سال پہلے عروض کے ایک مسئلے میں جناب نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی نے نفیس سے اختلاف کیا تھا اور حضرت جلیل کو حکم ٹھہرایا تھا۔ بعد میں اثر اسم با مسمیٰ ثابت ہوئے، یعنی نفیس کی مقبولیت سے اثر پذیر ہو کر اپنی لغزش کے قائل ہو گئے۔ یاس یگانہ بھی پہلے پہل نفیس کی برتری سے مایوس ہوئے تھے۔ لیکن فوراً ہی انھوں نے اپنے فیصلے اور انصاف پسندی و قدر شناسی میں اپنے آپ کو یگانۂ روزگار ثابت کر دیا۔''

نفیس کی شاعری

نفیس ایک قادر الکلام قدامت پسند شاعر تھے۔ انھیں جدید اصنافِ سخن خصوصاً ترقی پسند شاعری سے خدا واسطے کا بیزار تھا۔

نفیس بڑی حد تک اپنے نقطۂ نظر میں حق بجانب کہے جا سکتے ہیں۔ جدید شاعری کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ فن برائے فن نہیں بلکہ اس کو ہنگامہ سیاسی تحریکات کا تابع بنا دیا گیا۔ جدید شاعری کے علمبرداروں نے اپنے پریشان، پراگندہ افکار و خیالات کے اظہار کے لیے جب اپنا قافیہ تنگ پایا اور اوزان و بحوران کی راہ میں حائل ہونے لگیں، تو انھوں نے ردیف و قافیہ سے بے لگام ہو کر ایسی بھونڈی اصنافِ سخن اور تراکیب تراشنا شروع کیں، جنھیں آرٹ کہنا آرٹ اور جمالیاتی مذاق کی توہین ہے۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی ان کی شاعری کی قدر و قیمت طے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''محمد یوسف نفیس بنگلوری کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے، جو شاعری اور فن کو لازم و ملزوم جانتے تھے۔ نکات شاعری پر خود ان کی نظر گہری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کوئی فنی نکتہ سوالیہ علامت بنا انھوں نے اس کی وضاحت اساتذۂ سخن سے کروائی۔ اور پھر ان کا باقاعدہ ریکارڈ کیا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں فن شاعری سے کتنا زیادہ لگاؤ تھا۔''

نفیس کا فنی کمال

ایک خالص ماہرفن کی حیثیت سے نفیس کا مقام بلند ہے اگر چہ وہ ٹھیٹھ میسوری تھے اور ایک خالص دکنی اردو کے ماحول میں تربیت پائی، تاہم انھوں نے اپنی تحقیق وتجسس اور اپنے شوق و انہماک کے ذریعے اہل زبان میں اپنا مقام پیدا کرلیا ہے۔ وہ ایک مُسلّم ماہر عروض اور زبان داں تھے، اسی لیے آپ کا کلام زبان کی چاشنی اور شستگی سے لبریز اور تمام فنی عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ تذکیروتانیث اور زبان ومحاورہ کے استعمال میں آپ بڑے محتاط رہے۔ ان معاملات میں آپکا کلام اتنا ہی مستند ہے، جتنا کہ دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان کا ہوسکتا ہے۔

سہل ممتنع: سہل کلام کا کہنا ایک دشوار امر ہے۔ لیکن نفیس نے بعض لطیف و نازک جذبات وخیالات کے اظہار میں اتنی بے تکلفی، سلاست وروانی سے کام لیا ہے، وہ سہل ممتنع کا حکم رکھتا ہے۔ ان کے اس نوعیت کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:

ایک سے بڑھ کر ایک حسیں ہے شرمائے اترانے والا
اپنی کرنی اپنی بھرنی تڑپے گا تڑپانے والا
قلزم عشق میں سفینۂ دل ڈوب کر نہ عمر بھر نکلا
آنکھ سے میرے دل میں وہ آئے چاند ڈوبا کدھر کدھر نکلا

خمریات

نفیس کے کلام کی غالب خصوصیت ان کی خمریات ہیں۔ اگر چہ ریاض خیرآبادی کی طرح نفیس ذوق آشنا نہیں تھے۔ تاہم انہوں نے جوش اور سرمستی کے ایسے مظاہرے کیے ہیں، جنھیں دیکھ کر بعض اوقات ریاض کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ خمریات ایک ایسا وسیع اور دلچسپ موضوع ہے کہ جس کی آڑ میں کہنے والوں نے بعض اوقات شراب الست اور معشوق حقیقی کی محبت کے دو دھارے بہائے ہیں۔ جو فکرِ انسانی کا ایک گراں قدر سرمایہ بن گئے ہیں۔ نفیس بھی ریاض کی طرح ایک جواں مست خرام تھے، جو بے پیے جھومتے جاتے تھے۔ اس میدان میں بھی نفیس بلا شبہ اپنی قادرالکلامی کا زبردست نمونہ پیش کیا ہے۔ مثلاً

طور کی چوٹی تھی بوتل کے گر جانے کے بعد راز یہ ہم پر کھلا ایک جام چھلکانے کے بعد
ساقی محفل رہے تیری بھری محفل کی خیر میں رہوں گا آسماں پر ایک پیانے کے بعد

مئے کشو اس دور میں ہی پیر میخانہ نفیس میکدہ میں خاک اڑے گی ان کے اٹھ جانے کے بعد
یہ شئے طاق حرم میں کس نے اے پیر مغاں رکھ دی ارے جلدی اٹھالے مئے کی یہ بوتل کہاں رکھ دی

جب کبھی مسجد سے آئے سوئے میخانہ نفیس آپ کی تعظیم کو شیشے جھکے ساغر اٹھے
وضو بھی کرتے اسی سے نفیس مئے پیتے بجائے شیشہ ' مئے پاس زمزی ہوتی
میدان امتحاں میں عجب معرکہ رہا توبہ کے ساتھ ٹوٹی ہے بوتل شراب کی
نفیس اب ہاتھ کھینچو مئے کشی سے کہ مئے اس دور میں خلد آشیاں ہے

کفر کا فتویٰ:

اس رنگ میں نفیس نے ایک اور معرکہ آرا غزل کہی تھی، جس نے طبقہ علما میں ہلچل سی ڈال دی تھی۔ یہاں تک کہ نفیس پر کفر کے فتوے لگ گیے۔ بالآخر جناب محمود خاں محمود بنگلوری مصنف سلطنت خداداد نے جو اس وقت ہفتہ دار کوثر شائع کرتے تھے، اس غزل کے حقیقی معانی و مطلب کی تشریح کر کے نفیس کو کفر کے الزام سے بچانے کی کوشش کی۔ اس غزل میں نفیس اپنے تغزل و خمریات کی انتہا کو پہنچے ہوے ہیں۔ غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ارض حرم میں سنتے ہیں قلت ہے آب کی ساقی وہاں بھی نہر بہادے شراب کی
رحمت نے بڑھ کے میرے گناہوں کو لے لیا کیا دم بخود کھڑی رہی میزاں حساب کی
ڈھلتے ہی اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوگیا گویا شباب تھا کوئی بوتل شراب کی

خم خانۂ جلیل کا یہ فیض ہے نفیس
ٹپکی ہیں ابر کلک سے بوندیں شراب کی

نفیس کی تاریخ گوئی

نفیس کو تاریخ گوئی میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ مختلف مواقع پر نفیس نے جو مادہ ہائے تاریخ نکالے ہیں، وہ اپنی روانی، شگفتگی، نزاکت اور حسن بیان کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ ذیل کے چند قطعات ملاحظہ ہوں جو حضرت اختر نگینوی کے دیوان کی اشاعت پر نفیس نے لکھا تھا

باغ ہے دیواں، طبع ہے مالی، نقطے کلیاں، دائرے گل
رنگ انوکھا کلیوں کا ہے، بو ہے نرالی پھولوں کی
سال اشاعت ہجری میں یہ خوب ہی نکلا واہ نفیس
ہر صفحہ ہے دامن گل چیں، شعر ہے ڈالی پھولوں کی

1357ھ

نظام دکن کی طرف سے حضرت فصاحت جنگ جلیل کو خطاب کی ادائگی پر

ہے زیر نگیں کس قدر الفاظ و معانی　　کیا دسگہ خسرو اقلیم دکن ہے
لکھ مصرع تاریخ نفیس ''آب گہر'' سے　　''سلطان دکن بادشہ ملک سخن ہے''

1357ھ

حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی نے اس قطعہ تاریخ پر یہ نوٹ لکھا ہے:

''اگر اس میں 'آب گہر' کا تعمیہ نہ ہوتا تو مادے کے کیا کہنے! جی چاہتا ہے کہ آپ کو 'سلطان التاریخ' کا خطاب دے دوں۔''

حضرت جلیل کی تاریخ وفات یوں کہا ہے

کردہ درماہ صفر عزم سفر سوئے جہاں
کشور شعر و ادب رابود سلطانے جلیل
شیدہ آہ سال رحلتش گفتم نفیس
سدرہ بے جبرئیل اقلیم فصاحت بے جلیل

1364ھ

روزنامہ 'پاسبان' بنگلور کے اجرا پر حضرت نفیس کا رقم کردہ قطعہ' تاریخ:

بارک اللہ آج نکلا پاسبان بہر مسلم آئینۂ رحمت ہو یہ
لکھو تاریخ اشاعت اے نفیس ''پاسبان مذہب و ملت ہو یہ''

غرض نفیس کی شاعری اور ان کی تصنیفات جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کے معیار کا

پیانہ پیش کرتی ہیں۔ ملک کی ادبی انجمنوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کا فرض ہے کہ وہ اردو کے اس گراں قدر سرمایہ کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں۔

مولوی محمد خان (مرحوم) لکچرار مہاراجہ کالج، میسور حضرت نفیس کے تعزیتی جلسے منعقدہ 1951 کے موقع پر تاثرات پر مبنی ایک مبسوط مقالہ پیش کیا تھا۔ اس میں انھوں نے برملا طور پر اعتراف کیا ہے کہ

> ''میں نے تیس سال کی عمر تک اردو فارسی کا کافی اور عربی کا بقدر ضرورت مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے میں اللہ کا شکر بجالایا کہ تیس کی عمر میں بھی جو نفیس کو سمجھنے کے قابل ہوا تو یہ کوئی طویل مدت نہیں تھی۔ میں کس قدر بدنصیب ہوتا، جو ایسی عمر میں نفیس کا کلام دیکھتا، جبکہ میرے دل و دماغ میں انھیں سمجھنے کی استعداد نہ ہوتی اور میں اپنی بے مائگی سے نفیس کے متعلق کوئی ایسی رائے قائم کرلیتا کہ آج آپ قدردان نفیس کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔''

اپنی اسی تحریر میں ایک موقع پر حضرت نفیس سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نفیس نہایت درجہ کم آمیز تھے۔ وہ چار لمحوں سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ ان کے جاتے ہی میں نے مولوی صاحب سے (مولوی اسحاق صاحب میسوری) کہا کہ..... ''یہ شخص واقعی شاعر ہے۔'' انھوں نے پوچھا ''یہ کیسے پہچانا؟''..... میں نے کہا کہ ''ان کے نازک ہاتھوں سے''۔ میں نے ہاتھ کے نیچے کی بیسیوں تشبیہیں پڑھی ہیں، ان میں سے مجھے صرف ایک نہایت پسند آئی۔ وہ یہ ہے ''خمسہ درتوصیف شاہ حسن'' میں نے محسوس کیا تھا کہ نفیس کا ہاتھ خمسہ درتوصیف سلطانہ شاعری ہے۔

حضرت نفیس سے دوسرے موقع پر ملاقات کا حوالہ دے کر ان کے فنی محاسن اور نکات زبان پر عبور کا اعتراف یوں کیا ہے۔

> ''جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور بے تکلفی بڑھتی گئی، ہم نے ایک دوسرے کو خوب جانچا پرکھا۔ میں جس نتیجہ پر پہنچا وہ یہ ہے کہ زبان و ادب اردو فارسی کا کوئی ایسا نکتہ نہیں تھا، جس کو میں جانتا ہوں اور اس کو نفیس نہیں جانتے تھے۔ لیکن بے انتہا

ایسے مسائل اور نکات انھیں معلوم تھے، جنھیں میں اب بھی نہیں جانتا۔ میں اس حقیقت کا اظہار متعدد بار نفیس مرحوم کی زندگی میں کر چکا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ قواعد، عروض اور دبستان دلی ولکھنؤ کے روزمرے اور محاورے کے نفیس جس قدر ماہر تھے، اتنے ہی ہندوستان میں اور بھی ماہر موجود ہیں۔ کہیں ان سے بڑھ کر کوئی ماہر نہیں۔ مجھے اپنی ادبی زندگی میں جب کبھی کسی امر میں شبہ ہوا ہے تو تسلی صرف دو آدمیوں کی تحقیق سے ہوئی ہے۔ ایک ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الٰہ آبادی اور دوسرے حضرت محمد یوسف بنگلوری۔"

مولوی محمد خان صاحب کے مطابق حضرت نفیس فارسی میں بھی غزل کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک غزل بیخود دہلوی کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں، میسوری ہو کر ایران کی زبان میں غزل کہتے ہیں۔ اور اصلاح کے لئے دلی کو بھیجتے ہیں۔ گویا ایک یونانی کنڑی میں شعر کہتا اور اصلاح کے لیے مراقش کو بھیجتا ہے۔ میری اور میرے آباء کی زبان اردو ہے۔ چالیس برس سے مشق سخن کر رہا ہوں۔ اب کچھ اردو آئی ہے۔ آپ بھی اردو میں شاعری کریں گے تو اساتذہ کی اصلاحوں سے زبان داں بن جائیں گے۔ خان صاحب لکھتے ہیں کہ اس تبصرے کے بعد انہوں نے فارسی میں مستقل طبع آزمائی ترک کردی۔

وقت کے جن مشاہیر و ماہرین سخن سے خط و کتابت رہا ہے اور آپ نے نکات زبان اور فن شاعری پر استفسارات کیے ہیں، ان کی ایک طویل فہرست ہے، بعض نام تذکرے میں آچکے ہیں۔ لیکن جملہ تعداد 26 ملتے ہیں۔ حضرت نفیس کے نام مشاہیر کے جو خطوط آئے ہیں، زبان و ادب کے باذوق احباب خصوصاً مشق سخن کرنے والوں کے لیے معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اسی طرح متروکات و مستعمل الفاظ پر اساتذۂ سخن سے آپ کا استفادہ بھی شعرا کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ آپ کے نام مشاہیر کے خطوط کے چند مکتوب بطور نمونہ پیش کرنے میں طوالت کا خوف حائل ہے، ورنہ اسے ضرور پیش کرتا۔

بحیثیت خوش نویس:

مذکورہ بالا علمی خوبیوں کے علاوہ باری تعالیٰ نے آپ کو ایک اور فن سے نوازا تھا۔ وہ ہے فن

خطاطی وخوش نویسی۔ حضرت ممتاز مرحوم سے آپ نے خوش نویسی کی تعلیم پائی اور اس فن میں وہ کمال پیدا کیا کہ لاہور اور دہلی کے اچھے سے اچھے کاتبوں نے آپ کے فن کو سراہا۔ کاتب دین محمد صاحب لاہوری حضرت پیر جماعت علی شاہ کے ساتھ جب بنگلور تشریف لائے تو آپ کی خوش نویسی کی بہت تعریف کی۔ اس پر مستزاد زود نویسی آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ دو چار دن کا کام ایک ہی دن میں پورا کردیا کرتے تھے، پھر بھی حروف کے خط وخال میں ذرہ بھی فرق نہ آتا تھا۔ اس لیے بے تکلف ساتھی آپ کو مزاحاً 'موٹر رقم' کہہ کر بھی پکارتے تھے۔

ناقدر شناسی کا شدید احساس اور گمنامی کا راز:

حضرت نفیس خاموش مزاج، غیور اور خوددار طبیعت کے انسان تھے۔ لیکن اس خاموش طبیعت میں علم وفن کا موجیں مارتا سمندر پنہاں تھا۔ علمی وادبی کارہائے نمایاں انجام دے کر بھی دنیائے ادب نے انھیں وہ مقام ومرتبہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ساری زندگی گمنامی کے غار میں گذاردی۔ حالانکہ بیسویں صدی کے 30 اور 40 کی دہائی کے دوران شمال کے ادبی جرائد و رسائل میں نمایاں طور پر چھائے رہے۔ لیکن خود اپنوں کی بے اعتنائی اور یاروں کی ناقدر شناسی کا شدید احساس ایک روگ بن کر اذیت دیتا رہا۔ اگر چہ وہ ذاتی طور پر نام ونمود اور بے جا تشہیر کے نہ قائل تھے اور نہ ہی اس کی طلب رکھتے تھے۔

فردوسی جیسے شاعر کو سلطان محمود کے ہاں سے اشعار کا صلہ نہ ملنے سے جو مایوسی ہوئی، جگ ظاہر ہے کہ اس کی غیرت نے نکل جانے پر مجبور کیا۔ پھر وہ گھر ایسا کنج عزلت میں بیٹھا کہ موت ہی نے آکر اٹھایا۔ سلطان کو اس غیرت مند شاعر کی قدر بعد میں معلوم ہوئی۔ اور ایک گراں قدر رقم اس کے پاس بھیجی۔ مگر وہ اس وقت پہنچی جبکہ اس کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ فردوسی کی ایک ہی لڑکی تھی، غیرت مند شاعر کی غیور لڑکی نے بھی اس انعام کو قبول نہ کیا بلکہ اسی طرح واپس کردیا۔

بہ قول اسماعیل تابش ناقدر شناسی کے احساس نے نفیس کو زندگی ہی سے مایوس کردیا تھا۔ ان کا یہ بھی اعتراف ہے کہ نفیس کو وہ عوامی شہرت حاصل نہ ہوسکی، جو بعض دیگر شعرا کو حاصل ہے۔

حضرت نفیس کے ساتھی مولوی محمد خان اس بابت کیا کہتے ہیں، ملاحظہ کریں:

''نفیس کی زندگی کا طربیہ اور نشاطیہ پہلو آپ کو نفیس ہی کی ذات میں ملے

گا۔سوانح نفیس کی تلخیاں آپ کے کام ودہن سے گذر کر رگ و پے میں جب
سرایت کر جائیں گی۔تو میں نفیس کے قند مکرر کی چند ڈلیاں آپ کو کھلا دوں گا۔
تا کہ آپ سوانح نفیس سے متاسف ہو کر نہیں، بلکہ محظوظ ہو کر گھر جائیں۔جو شاعر
عمر بھر ابنائے زمانہ کے گلے یا صلے سے بے نیاز رہا،اس کے متعلق ہمیں کوئی حق
نہیں پہنچتا کہ اس کے سوانح زندگی کو ہم ترحم کی نظر سے دیکھیں۔آپ نفیس کو بے
دماغ، بدمزاج، زود رنج کچھ بھی خیال کر لیجیے، میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔لیکن
خدارا اس مجاہد فن کی زندگی کو رحم کی نظروں سے نہ دیکھیے۔میں جانتا ہوں کہ وہ
اپنے ماحول کی سب بے اعتنائیوں کو معاف کردیں گے،لیکن کوئی انھیں نظر کرم
سے دیکھے تو وہ قیامت میں ضرور دامن گیر ہوں گے۔

سب جانتے ہیں کہ شہزادہ معظم جاہ حیدرآبادی ، جب وہ بنگلور آئے تھے تو
نہایت اعزاز و اکرام سے نفیس کو طلب کیا۔نفیس نے یہ کہہ کر جانے سے انکار
کردیا کہ ”مجھے بڑے آدمیوں سے ملنے کی عادت نہیں۔غالب اہل کرم کا
تماشہ دیکھنے کے لیے ہی سہی، لیکن فقیروں کا بھیس تو بدلتے تھے۔لیکن نفیس کی
خودداری کوئی روپ بھر کر تماشہ دکھانے کی بھی روادار نہ ہوئی۔نفیس کی خودداری
اور کم آمیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مخالفوں نے جو بھی افواہ ان کے خلاف
اڑادی،اس کو خواص نے صحیح مان لیا“۔

عبدالہادی رفعت مرحوم نے بھی اپنی ایک تحریر میں ان کے ساتھ ہوئے اس سلوک پر ملال ظاہر کیا
ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

”آپ کی سب سے بڑی خصوصیت خودداری، اصول کی پابندی اور طبیعت کا
انکسار تھا۔مگر افسوس ہے کہ ان تمام اوصاف کے باوجود ان کی قدر زندگی میں
اتنی نہ ہوسکی، جتنی کہ ہونی چاہیے۔“

ہفت روزہ 'جمہور' کے مدیر احمد اللہ خاں نے حضرت نفیس کو شاعر کی حیثیت سے بڑھ کر دیکھا

ہے اور انھیں اس عالم گمنامی اور ناقدر شناسی میں بھی صابر وشاکر پایا ہے۔ وہ ان کی ذات گرامی کو ایک شاعر کے قد سے کہیں بلند تر قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''نفیس کا مقام شاعر کی حیثیت سے بھی اونچا تھا۔ اور وہ تھا ان کا کردار اور ان کا علم وفضل۔ وہ کم گو تھے۔ مگر انھوں نے جتنا بھی کہا وہ بہت زیادہ پر بھاری رہا۔ نفیس کی زندگی جیسی بھی تھی، وہ ہر حیثیت سے صابر وشاکر رہے۔

ستم کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ہمراہ 'ظریفی' کو لیے رہتا ہے۔ یہ جب نفیس پر نازل ہوا تو نفیس نے خندہ جبینی کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی صبر وشکر کو دعوت دے کر کہا کہ'' آؤ میرے یہاں ستم ظریفی مہمان ہے۔ اس کی دلجوئی کے لیے اس کے ساتھ رہو۔ تا کہ زمانے کی ستم ظریفی بعد میں یہ گلہ نہ کرے کہ نفیس! میں تیری مہمان رہی تو تو نے میری دلجوئی کا کوئی سامان فراہم نہیں کیا۔''

عقیدت کے پھول:

شہر بنگلور کے جلیل القدر شاعر وادیب دنیائے اردو کو مالا مال کر کے 23رجنوری 1951 کو دار فانی سے دار بقا کو کوچ کر گئے۔ سانحہ سے ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ وقت کے تمام اخبارات نے خراج عقیدت میں اداریے لکھے۔ مقامی و بیرونی شعرا نے مرثیے اور قطعات تاریخ وفات نذر کیے۔ مختلف ادبی اداروں اور شخصیات کے تعزیتی خطوط کے انبار لگ گیے۔ ان سب کا احاطہ یہاں ممکن نہیں، تاہم خراج عقیدت کے چند پھول پیش خدمت ہیں؛

''آج جب کہ اردو زبان ہمارے ملک میں ایک بحرانی دور سے گذر رہی ہے، اور اپنے بھی خواہوں کا منہ تک رہی ہے، حضرت نفیس جیسے ممتاز سخنور کا اس جہاں سے منہ موڑ لینا اردو ادب اور اردو شاعری کے لیے انتہائی بدقسمتی کا موجب ہے۔''...............محمد اسمٰعیل تابش، مدیر روزنامہ پاسبان، بنگلور)

''جنوبی ہند کے لیے حضرت نفیس کی ذات مغتنمات زمانہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ نہ صرف ایک بہترین شاعر اور خوش نویس تھے، بلکہ فنی معلومات اور وسعت مطالعہ کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ دوستوں میں

ایک بہترین دوست، شاعروں میں ایک بہترین شاعر، شاگردوں میں ایک ہمدرد استاد بن کر آپ نے ایک مثال قائم کردی تھی۔"............(عبدالہادی رفعت)

"نفیس اگرچہ بہ ظاہر صوفی نہیں تھے، مگر ان کے خیالات اور ان کی صلاحیتوں سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ فکر و ذکر کے سلسلے میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔"..................(احمد اللہ خاں، مدیر ہفت روزہ 'جمہور' بنگلور)

"افسوس ہے کہ آج ہم سے ایسی نام و نمود اور جاہ و منصب سے متنفر اور باکمال ہستی اٹھ گئی۔ آپ کے بے وقت انتقال نے بنگلور کے سر افتخار کو جھکا دیا ہے۔ اس دور قحط الرجال میں تو آپ کا کوئی جانشیں نظر نہیں آتا اور آپ کی یہ جگہ اس وقت تک خالی رہے گی، جب تک کہ خدا کسی اور کو پیدا نہ کردے۔"..................(بشیر الدین احمد معجز، محرر روزنامہ 'بیدار' بنگلور)

"حضرت نفیس ایک قابل شاعر اور ماہر فن ہونے کے لحاظ سے بنگلور کی ایک ایسی ہستی تھی، جو آئندہ چل کر ہندوستان بھر میں بطور مثال پیش ہوگی۔ بنگلور نے آپ کی کوئی قدر نہ کی، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ زمانہ آپ کی صلاحیت اور قابلیت کی قدر کرنے پر مجبور ہوگا اور اہل بنگلور شمالی ہند کے روبرو حضرت نفیس کو پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرنے لگیں گے۔"..................(عبدالعظیم خاں عزمی، مدیر روزنامہ آزاد، بنگلور)

"درحقیقت اہل بنگلور نے ایک ایسا گوہر بے بہا پایا تھا، جو اپنی نفاست مزاج، پاکیزگی طبع، عظمتِ تخیل اور شوکتِ فکر کی وجہ سے چوٹی کے شاعروں میں منفرد تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اہلِ بنگلور نے حضرت نفیس کے کلام کی قدر و منزلت ان کے زمانے میں نہیں کی۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ اہل بنگلور ہی نہیں، ہر شہر اور ہر ملک میں تقریباً تمام صاحبانِ فن و کمال کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا ہے، ایسی صورت میں حضرت نفیس کی ذات کیسے مستثنیٰ قرار پاسکتی ہے۔"............(لیس بھٹناگر)

ماہنامہ عالمگیر (لاہور) ودیگر جریدوں میں شائع نمونۂ کلام:

غزل

جمالِ یار بھی ہے جلوۂ بہار بھی ہے
مری نظر میں چمن بھی ہے گلعذار بھی ہے

مری نظر ہے جو انجام کار پر ساقی!
سرور بھی ہے مری آنکھ میں خمار بھی ہے

وہ گلعذار جو آیا ہے فاتحہ پڑھنے
ہماری قبر پہ جوبن بھی ہے بہار بھی ہے

وہ دستِ ناز جو رکھے ہیں میرے سینے پر
دلِ طپیدہ کو راحت بھی ہے قرار بھی ہے

کمی ہے کیا مرے دامن میں لعل و گوہر کی
یہ چشم تر جو ہے خونبار اشکبار بھی ہے

نگاہِ ناز کے قبضہ میں ہیں اگر چھریاں
ادا کے ہاتھ میں شمشیرِ آبدار بھی ہے

یقین ہو مجھے فصلِ بہار کا کیوں کر
مرے لباس میں باقی جو ایک تار بھی ہے

میں بے خودی میں جو لپٹا گلے سے وہ بولے
عجب ہے مست کہ مستی میں ہوشیار بھی ہے

وہی اداسی وہی بے کسی وہی وحشت
تہِ مزار ہے جو کچھ سرِ مزار بھی ہے

اندھیری رات میں آتے ہیں وہ زیارت کو
صبا! بتا کوئی شمع سرِ مزار بھی ہے

لہو بہا کے شہیدوں کا نام زندہ کر
گلوئے خشک بھی ہے تیغِ آبدار بھی ہے

یہ اٹھ کے کہتے ہیں ساقی کی رس بھری آنکھیں
بتاؤ تو کوئی محفل میں ہوشیار بھی ہے

نفیس دردِ محبت پہ جان دیتا ہے
پھر اس پہ مضطرب اور بے قرار بھی ہے

(ماخوذ از: ماہنامہ عالمگیر (لاہور) شمارہ نومبر 1928)

یہ دل میں اے خدا کس برق وش کی یاد آتی ہے
کہ بے تابی مجھے دینے مبارکباد آتی ہے

ترے ظلم و ستم کی داد دینے کو مرے لب پر
فغاں آتی ہے نالے آتے ہیں فریاد آتی ہے

تصور جب کیا تصویرِ جاناں کھنچ گئی دل میں
تجھے صورت گری ایسی کہاں بہزاد آتی ہے

تصور اس کرم کے میں کبھی تنہا نہیں رہتا
کہ جس دن تم نہیں آتے تمھاری یاد آتی ہے

تمنائے شہادت جو سلیقی ہے لہو میرا
تجھے غیرت نہیں اے خنجرِ جلاد آتی ہے

شجر جو کوہ پر اُگتا ہے اس کی پتی پتی سے
اگر سونگھوں تو بوئے حسرتِ فرہاد آتی ہے

جلیل آنکھوں کے پیمانے چھلک جاتے ہیں
وہ اگلی صحبتِ پیرِ مغاں جب یاد آتی ہے

(ماخوذ از: عالمگیر، شمارہ سالانہ نمبر جون 1930)

کلامِ نفیس:

نتیجہ فکر مولانا محمد یوسف صاحب نفیس بنگلوری تلمیذِ رشید حضرت جلیل مدظلہ
جانشیں امیر مینائی لکھنویؒ

نقاب عارض رنگیں جو الٹے یارا بھی — ہزار جان سے ہان ہو بہارا بھی
ہوا زمانہ مگر ہے یہ داغ دل کا اثر — کہ گلفشاں ہے چراغ سرمزار ابھی
مئے الست تھی کیا تند وتیز اے ساقی! — وہی سرور ہے باقی وہی خمار ابھی
جو تم رہو تو رہے رنگِ گلستاں قائم — جو تم چلو تو چلے موسم بہار ابھی
گلہ ہو کیا مجھے ساقی کی کم نگاہی کا — کہ چشم مست سے آنکھیں ہوئیں دوچار ابھی
وہ دل کہ جس میں تھا رنگ خلوص و بوئے وفا — بنا نہ ہائے کسی کے گلے کا ہار ابھی
پلادے پھول نہ رکھ انتظار میں ساقی! — بہار پر ہے ارے موسم بہار ابھی
نگاہِ شوخ جو ہو جائے مہرباں مجھ پر — سکون پائے مرا قلب بے قرار ابھی
کمال ہے یہ تصور کا بعد مدت بھی — یہ ہے گماں کہ دیکھا ہے روئے یار ابھی
ہزار بار انھیں آزما چکا پھر بھی — ہے میرے دل کو حسینوں کا اعتبار ابھی
پیے ہوئے ہوئی اک عمر مست رکھتا ہے — نفیس نشۂ صہبائے خوشگوار ابھی

(مطبوعہ: عالمگیر، شمارہ سالانہ نمبر جون 1930)

بجلیاں چمکیں جو وہ بدلے ہوئے تیور اٹھے — قتل گاہ میں شور تھا تیغیں کھینچیں خنجر اٹھے
شور اٹھا بزم مے سے رند جب پی کر اٹھے — دیکھنا! وہ بندگان ساقی کوثر اٹھے
تیرا دیوانہ جو نکلا اس کے لینے کے لیے — ہیر یلا نکل سے آئیں دشت سے پتھر اٹھے
جمع ہو سکتے نہیں پھر اتنے مشتاق جمال — آج پھر پردہ نشیں پردہ شر محشر اٹھے
چشم ساقی نے اشاروں میں نہیں کیا کہہ دیا — توڑ کر توبہ جو بیٹھے پھینک کر ساغر اٹھے
تربِ عاشق پہ جو بیٹھا وہ افسردہ اٹھا — شمع تو گل ہو کے اٹھی پھول مرجھا کر اٹھے
میں چلوں تو ساتھ میرے میری رسوائی چلے — وہ اٹھیں تو ساتھ ان کے فتنۂ محشر اٹھے
پاؤں جب تک چل سکیں پیر مغاں کے گھر چلیں — ہاتھ جب تک اٹھ سکے مینا اٹھے ساغر اٹھے

کیوں نہ ایک لحظہ کی عظمت پر ہو ماتم عمر بھر ۔۔۔ دل سی شئے ہم ان کی بزم ناز سے کھو کر اٹھے
میرے ساقی تو اٹھایا اک دکان سے اٹھی ۔۔۔ خم چلے میکش بڑھے شیشے بٹے ساغر اٹھے
بے گناہ پر جو اٹھا ہو قتل گاہِ ناز میں ۔۔۔ ہاتھ اب وہ فاتحہ کے واسطے کیوں کر اٹھے
جب کبھی مسجد سے آئے سوئے میخانہ نفیس ۔۔۔ آپ کی تعظیم کو شیشے جھکے ساغر اٹھے

(مطبوعہ: جنوبی ہند کا بہترین ادب 1958)

کتب ماخذات

(1) افادات نفیس ۔۔۔ مطبوعہ 1985

(2) استفسارات نفیس ۔۔۔ مطبوعہ 1993

(3) اصطلاحات اردو ۔۔۔ مطبوعہ 1986

(4) متاع ہنر: انتخاب کلام نفیس ۔۔۔ مطبوعہ 1982

(5) ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما ۔۔۔ از: تصنیف ڈاکٹر حبیب النسا بیگم ولی اللہ (مرحومہ)

(7) ماہنامہ عالمگیر (لاہور) ۔۔۔ شمارہ نومبر 1928 و سالانہ نمبر 1930

(8) جنوبی ہند کا بہترین ادب ۔۔۔ مطبوعہ 1958

سید غوث محی الدین

بانی روزنامہ 'الکلام'

کلیم الملک سید غوث محی الدین معروف بہ 'بابائے صحافت' کا شمار جنوبی ہند کی ان ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے نہ صرف اسلاف کے دینی، ادبی، سیاسی، تہذیبی، تصنیفی اور صحافتی ورثے کی حفاظت کی، بلکہ اس گراں بار امانت کو نئی نسل تک پہنچانے میں امینِ صادق ثابت ہوئے۔

سید غوث محی الدین ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ثلث صدی پر محیط زندگی میں مختلف شعبوں سے وابستہ رہ کر ایسے مختلف النوع کارنامے انجام دیے، جن کا اعتراف آج کے دور میں محال معلوم ہوتا ہے۔

آپ 1890 میں پیدا ہوئے۔ حسب ونسب ٹیپو سلطان شہیدؒ کے وفا شعار سپہ سالار حضرت سید غفار شہیدؒ (متوفی 1799) سے منسوب ہے، حتی کہ بعض مقالہ نگار نے آپ کو ان کا پوتا لکھا ہے۔ جنوب ہند کے نامور شاعر و ادیب حکیم محمد امام امامی (متوفی 2000) نے اپنی تصنیف 'نقوشِ تاثرات' میں آپ کا وطن قصبہ چولور متصل ہندو پور تحریر کیا ہے۔ جو اب تملناڈ کے علاقہ میں ہے۔ ابتدائی زندگی کے متعلق تحریر کیا ہے کہ:

''شہر کے ایک تاجر کتب عبدالرحمٰن فیضی مرحوم جب کتابوں کی تجارت کے لیے

اس قریہ کو گئے تو آپ ان کے ہمراہ ہو لیے۔ چونکہ روزگار کی وجہ سے آپ وہاں
بہت تنگ حال تھے۔ فیضی صاحب مرحوم نے سب سے پہلے آپ کو پریس کے
کام میں لیا پھر تھوڑا بہت پڑھایا لکھایا اور پریس کا کام بھی سکھایا۔ یہاں سے
گویا آپ کی ترقی شروع ہوئی"۔

بحیثیت معلم:

انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ پھر ٹیچر ٹریننگ کالج سیدا پیٹ (مدراس) سے ٹریننگ کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ تدریسی کیریر کا آغاز ایک عام اسکول ماسٹر کی حیثیت سے کیا۔ اس کے بعد معسکر بنگلور کے ایک سرکاری ٹیچر ٹریننگ اسکول میں آپ کی تقرری ہوئی۔ معسکر بنگلور آزادی سے قبل علما، ادبا، اور شعرا کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ کوئی بیس اساتذہ آپ کی زیر تربیت تھے۔ ان میں سے 18 رکو اساتذہ امتحان میں کامیابی ملی۔

آپ کی غیر معمولی تعلیمی لیاقت و تدریسی صلاحیت سے حکومت ہند کے تعلیمی افسران بہ خوبی واقف و متاثر تھے۔ غرض 1919 میں ماہانہ پچاس روپے وظیفہ پر ہائر سکنڈری گریڈ ٹریننگ کے لیے ٹیچر کالج سیدا پیٹ مدراس میں تقرری عمل میں آئی۔ جہاں تدریس کے دو سال کامیابی سے گذارے۔ 1921 میں جب آپ شہر بنگلور واپس ہوئے تو ایک مدرسے میں ہیڈ ماسٹر کا عہدہ تفویض کیا گیا۔

تدریس کے باوقار منصب پر فائز رہتے ہوئے آپ کی طبیعت صحافت کی طرف مائل ہوئی، تا کہ اسکے ذریعہ بھی طلبہ و اساتذہ کو فائدہ پہنچائیں۔ غرض 1914 میں 'علم و عمل' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ نکالا، جو تدریسی نکات پر مشتمل تھا۔ اس میں اساتذہ و طلبہ کے لیے مفید ترین مضامین کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی مضامین ہوتے تھے۔ ملک بھر میں اس رسالہ کی پذیرائی ہوئی۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس رسالہ کی افادیت کا شہرہ اس حد کو پہنچ گیا کہ میسور اور مدراس کی حکومتوں نے اس رسالہ کی سیکڑوں کاپیاں خرید کر علمی حلقوں میں تقسیم کی اور تعلیمی حلقوں میں آپ کی وسعت معلومات کا خوب چرچا ہوا۔

بحیثیت صحافی:

دوران تدریس یا اس کے بعد جو تصنیفات آپ کے نوک قلم سے منصۂ شہود پر آئیں، ان کا

ذکر تصنیفات کے بیان میں آئے گا، (انشاء اللہ)۔ یہاں آپ کے صحافتی کردار کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے۔ اس ضمن میں صحافت کی طرف آپ کا میلان اور آسمان صحافت پر 'علم وعمل' کا نمودار ہونا قابل ذکر بات ہے۔ اس کے دوررس نتائج پر نگاہ ڈالیں تو یہ ایک فال نیک معلوم ہوتا ہے۔ یہ چونکہ خالص علمی مباحث پر مشتمل رسالہ تھا، لہٰذا صحافت کی لذت آشنائی اور قوم وملت کے درد کی کسک نے رسالہ سے ایک مستقل اخبار نکالنے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ 1924 میں کلیم الملک سید غوث محی الدین نے 'الکلام' نام کا ایک اخبار شروع کیا جو ایک سال تک ہفتہ وار رہا، بعد میں روزنامہ میں تبدیل ہو گیا۔ بلاشبہ اخبار نکالنا بطور خاص اس دور میں اتنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ہمت مرداں کے ساتھ ساتھ، مدد خدا بھی لازم وملزوم ہے۔

پروفیسر بی شیخ علی اخبارات سے متعلق پیچیدگی اور دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> ''اخبار نکالنا بچوں کا کھیل نہیں، اس سنگلاخ زمین کے کانٹے کوئی مولانا محمد علی جوہر سے پوچھے، یا مولانا آزاد سے، صحافت کی پیچیدگیاں تلخ تجربات، مالی مشکلات، سیاسی مجبوریاں، وہ سنگین مراحل وہی لوگ جانتے ہیں، جو اس خاردار میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔''

اب اس دور کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں، جس میں الکلام وجود میں آیا۔ اس وقت صحافت کس صورت حال میں تھی اور ماحول اس کے وجود کی بقا کے لیے کس قدر سازگار، یا ناسازگار تھا، اس کا علم، الکلام' کے وجود کی حیثیت اور اہمیت کو جاننے میں معاون ومددثابت ہوگا۔

'الکلام' 1924 میں شروع ہوا جو کہ بیسویں صدی کا شروعاتی دور تھا۔ یہ سری کرشن راج وڈیر کے عہد کا ابتدائی دور تھا۔ مجموعی اعتبار سے یہ زمانہ میسور میں اردو صحافت کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں لوگوں کا زیادہ تر رجحان انگریزی تعلیم کی طرف بڑھ گیا تھا اور مقامی زبانیں تنزل پذیر ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی مالی حالت نہایت خستہ ہو گئی تھی۔

اخبارات ورسائل کی حوصلہ افزائی تو درکنار، بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل ناممکن سی ہو گئی تھی۔ اس معاشی بدحالی سے اردو اخبارات کو کافی حد تک نقصان پہنچا اور کچھ اخبارات نے حالات کی ستم ظریفی کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیا اور جو باقی رہ گئے، اس کا معیار پست ہو گیا۔ اس

صورت حال کے باوجود محبانِ اردو نے اردو کی خدمت سے خود کو وابستہ رکھا اور مقدور بھر کوشش سے اخبارات و رسائل زندگی کی رمق لیے افقِ صحافت پر ٹمٹماتے رہے۔

ان ناسازگار حالت میں بھی جو رسالہ جات اور اخبارات اردو کی شمع جلائے ہوئے تھے، ان میں اڈورڈ (1901)، پنچ الینج (1902) النصیر، المیسور، نگارستان خیال (1908)، رسالہ حبیب (1909)، پھر 1915 تا 1916 جارج گزٹ، شاہ راہِ ترقی، المسلم، اڈوائزر، ہلال، برق سخن، شوکت عثمانیہ اور اسی اثنا میں علم و عمل نکلا۔ علاوہ ازیں کل آٹھ اخبارات کمرشیل اینڈ ٹکنیکل کے نام سے نکل رہے تھے۔

1917 اور اس کے بعد کے ادوار میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ پیکر خیال، العرفان، مذاق عروج، گلزار عروج، ترانہ اور آفتاب بعد کے چھ برسوں میں نکلنے والے اخبارات ہیں۔ تاہم حالات عمومی طور پر حوصلہ افزا نہ ہونے کے سبب اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے۔ اسی دوران صحافت کے دورِ تنزل کے دبیز پردے کو چاک کرتا ہوا ’الکلام‘ 1924 میں آب و تاب کے ساتھ افق صحافت پر نمودار ہوا۔ جب یہ بہ حیثیت روز نامہ شروع ہوا تو اس وقت اس کا کوئی قابل ذکر حریف یا مقابل نہ اردو میں تھا اور نہ کسی دوسری زبان میں۔ اس لئے اردو، انگریزی اور کنڑا اخباروں میں ’الکلام‘ کو ریاست میسور کا قدیم اخبار تسلیم کیا گیا ہے۔

الکلام کے اجرا کے کچھ عرصے بعد سے 1940 تک کم و بیش 20 جرائد و رسائل اور روزنامے اخبار منظر عام پر آئے۔ ان میں روزنامہ بنگلور (1928) زیر ادارت شفیق الملک عباس خاں صاحب مرحوم، ’قوم‘ زیرِ ادارت ابوسعید عبدالقیوم (1933) میں نکلا۔ 1940 کی دہائی میں روزنامہ ’آزاد‘ محمد علی کمال، محمد مصطفیٰ غازی اور عبدالعظیم خان عزمی کی ادارت میں اور روزنامہ ’پاسبان‘ 1946 میں محمد اسماعیل تابش کی ادارت میں نکلا۔

الکلام کے ہم عصر اخباروں میں آزاد اور پاسبان کا نام آتا ہے، جن میں ’الکلام‘ ہی استقلال کے ساتھ 1968 تک اردو طبقہ کے دل کی دھڑکن بنا رہا۔ روزنامہ پاسبان تا حال کسی طرح اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ الکلام کا وجود ریاست میسور اور بنگلور کی عظمت رفتہ کو بحال رکھنے میں ایک اہم پیش رفت ثابت ہوا۔ چونکہ انیسویں صدی میں یہاں ادب وصحافت کی تاریخ بڑی تابناک اور شاندار رہی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ 1900ء تک جنوب میں ڈیڑھ درجن کے قریب صرف اخبارات شائع ہورہے تھے۔ جن میں 'قاسم الاخبار بنگلور کے قیام (1811) کے بعد سب سے پہلا اخبار مانا جاتا ہے، جو 1861 میں جناب منشی محمد قاسم کی زیر ادارت نکلا تھا۔ اسی سال قادر باشاہ صاحب مرحوم کی زیرِ ادارت 'سلطان الاخبار' میدان میں اترا۔ پھر 'میسور' اخبار آیا، جس کے مالک و مدیر حافظ سید محمد، مالک مطبع فردوسی تھے۔ اس کے بعد اخبار 'منشور محمدی' زیر ادارت محمد عبدالمجیب آیا۔ اس زمانہ کے اخبارات کی فہرست میں نیر اعظم، بنگلور اخبار، مصلح، بادصبا، محافظ بنگلور، میڈ گزٹ، شمع سخن، دیوار اور سبل کے نام آتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کی اشاعت اچھی تھی۔ اور اگر ان اخباروں کا موازنہ اس زمانے کے کسی اخبار سے بھی کیا جائے تو تسلیم کرنا ہوگا کہ بہ لحاظ مضامین، کتابت، طباعت اور کاغذ کے بنگلور کے اخبارات ہی فائق تھے۔ تمام اخبارات نے تھوڑے بہت فرق سے اچھی عمر پائی جس کا تناسب ربع صدی سے نصف صدی تک ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بنگلور میں شعراء، ادبا اور اہل علم حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جس کے متعلق حضرت صابر مرحوم فرماتے ہیں۔

سیر کر لیتا ہوں صابر رات بھر جنت کی میں جب خیال آتا ہے مجھ کو خواب میں بنگلور کا

محمود خاں محمود لکھتے ہیں کہ

''ادیبوں اور شعرا کا دماغ آسمان پر تھا۔ یہاں تک کہ قاسم الاخبار کی ایک اشاعت میں میں نے دیکھا ہے کہ بنگلور اور لکھنؤ کے شعرا میں کسی شعر یا لفظ کے متعلق تکرار ہو رہی تھی تو بنگلور والے لکھنؤ والوں کو چیلنج دے رہے تھے۔ اور یہ اسی علمی کشاکش کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی 1887 میں لکھنؤ سے 'دلگداز' شائع کیا تو بنگلور سے اس کے جواب میں جناب قادر شریف

صاحب صابر مرحوم نے 'دلسوز' جاری کیا۔ دلگداز میں روسیوں اور ترکوں کی جنگ کا پلاٹ قائم کرتے ہوئے حضرت شرر مرحوم (متوفی 1926) نے ناول 'حسن انجلینا' لکھنا شروع کیا تو 'دلسوز' میں انگریزوں اور نواب حیدر علی کی لڑائی کا پلاٹ قائم کرتے ہوئے ایک دوسرے ناول کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر جب لکھنؤ سے 'پیام یار' شائع ہوا تو بنگلور سے بھی 'شمع سخن' جاری ہوا۔"

غرض 1900 کے آگے بنگلور اہل علم وفن کا مرکز رہا اور یہاں کی خاک سے وہ اہل کمال اٹھے، جن کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔

مذکورہ بالا اقتباس سے انیسویں صدی میں ریاست میسور و بنگلور کی علم وادب اور ثقافت کی روشن تاریخ کا نقشہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی بنگلور و میسور میں علم وادب اور صحافت کی ترقی کا روشن دور رہا ہے۔

اگر جنوب کی اس سے بھی قبل کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو 18 ویں صدی میں اردو کا سب سے پہلا اخبار 1794 میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے فرمان سے اسی سرزمین سے شروع کیا گیا تھا۔ حالانکہ محققین نے اردو اخبار کی اولین اشاعت کی تاریخ کو 19 ویں صدی سے جوڑا ہے، اور اس سلسلے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطنت خداداد سے اردو کا پہلا اخبار شروع ہوا۔ اس اخبار کا نام فوجی اخبار تھا، اور 1799 تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ یہ چونکہ سرکاری اخبار تھا، اس لیے صرف شاہی فوج، افسران اور سپاہیوں تک اس کی رسائی تھی۔ عوام تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔

ماضی کی اس جملہ تاریخ کی روشنی میں 'الکلام' کا وجود اور کم وبیش نصف صدی تک زمانہ کے سرد وگرم حالات کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے زندہ رہنا بڑی بات ہے۔ الکلام نے اپنی اس عمر عزیز میں ملت کے حالات ومسائل اور ان کے تقاضوں کو سیاسی وسماجی گلیارے سے لے کر ارباب حکومت تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا۔ ریاست میسور کے مسلمانوں کا ہر دلعزیز، ملت کا ترجمان اور صحافتی اقدار کا پاسبان بن کر آسمان صحافت پر درخشندہ وتابندہ رہا۔ سید غوث محی الدین الکلام کی بے باک صحافت اور بے لاگ تبصرے سے 'بابائے صحافت'

کہلائے۔ آپ کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ میسور نے تاحیات کے لیے وظیفہ مقرر کیا اور 'کلیم الملک' کے باوقار خطاب سے آپ کی عزت افزائی کی۔

اخبار 'الکلام' سے متعلق تذکرہ میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے جنوبی ہند کا سفر اور اس موقع پر 'الکلام' کے خصوصی شمارہ کی اشاعت کا ذکر نہ کیا جائے تو الکلام کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ 1929 میں جب علامہ اقبالؒ بنگلور تشریف لائے، تو مدیر الکلام نے اس موقع کو غنیمت جان کر الکلام کا خصوصی شمارہ، علامہ کے نام شائع کیا۔ مزید شعرائے کرام کی طبع آزمائی کے لیے ڈاکٹر اقبال کا ایک مصرع۔

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو...... دیا گیا تھا۔ جس پر ریاست بھر کے اہل سخن نے اپنے فنی جوہر دکھائے۔ معسکر بنگلور کے ریلوے اسٹیشن پر اخبار کے عملے کے ہمراہ پھول کے ہاروں سے علامہ کا استقبال کیا گیا اور خدمت میں اقبال نمبر پیش کیا۔ یہی وہ موقع تھا جب آپ کو علامہ اقبالؒ کے سکریٹری اور پھر رفیق سفر بننے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔

دیوان میسور سر مرزا اسمٰعیل (متوفی 1959) نے علامہ اقبال سے جب آپ کی یہ عقیدت اور محبت دیکھی تو فرمایا کہ "جناب غوث محی الدین صاحب میں آج آپ کو حکومتِ میسور کی طرف سے ڈاکٹر اقبال کا سکریٹری مقرر کرتا ہوں۔ جب تک وہ میسور اسٹیٹ میں قیام فرمائیں، آپ ان کے ساتھ رہیں۔"

غوث محی الدین صاحب نے اس اعزاز کو بصد شوق اور خوشی قبول کیا اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت گذاری میں، جس خلوصِ دل سے حصہ لیا، اس سے ڈاکٹر صاحب محظوظ ہو کر حضور نظام دکن کے مدار المہام سر اکبری کو تار دیا کہ آپ (غوث صاحب) کو حیدرآباد آنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ پھر وہاں سے تار آیا اور آپ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ حیدرآباد تشریف لا کر حضور نظام کے مہمان بنے اور علامہ ڈاکٹر اقبال کے رفیق سفر ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

آپ کو علامہ اقبال کی نصیحت کہ 'قلم سے کام لو سید، ہیں بے کار اب شمشیریں' کو اپنی صحافتی زندگی میں خوب برتا۔ قلم کی جولانی اور فکر کی پرواز نے صفِ اول کے صحافیوں میں لا کھڑا کیا۔ الکلام آپ کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

الکلام صرف ایک اخبار نہیں تھا، لوگوں میں دینی شعور و آگہی پیدا کرنا اور ان کی دینی ذہن سازی بھی اس کا مشن تھا۔ اسی غرض و غایت کے پیش نظر مولانا مولوی عبدالعزیز (حیدرآبادی) کے مرتب کردہ 'خطباتِ جمعہ' کے اقتباسات ہر جمعہ کو شائع کیے جاتے، تاکہ ائمۂ مساجد و خطیب حضرات اس سے استفادہ کر کے خطبہ دیں۔ اس کی کاپی ساری ریاستِ میسور کی مساجد کو مفت بھیجی جاتی۔ اس طرح الکلام بیک وقت دین کے فروغ میں بھی سرگرم عمل رہا۔

مؤرخ و پروفیسر جناب بی شیخ علی کی تحریر کا درج ذیل اقتباس جہاں صحافت کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتا ہے وہیں مدیر الکلام کی صحافتی خدمات کا بھی برملا اعتراف کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

> "صاحب موصوف صحافت کے غازی تھے۔ ریاستِ میسور میں اردو کا اہم اخبار 'الکلام' انھی کے ہمت و حوصلہ کا رہینِ منت ہے۔ صحافت، سیاست کا چوتھا ستون ہے۔ جمہوری نظام کا اثاثہ ہے۔ شہری حقوق کا پاسبان ہے۔ یہ وہ طاقت ہے، جس سے اربابِ حکومت بھی لرز جاتے ہیں۔ میسور کے مسلمان اس حربہ کی اہمیت سے ناواقف و بیگانہ تھے۔ جبکہ شمالی ہند میں اردو صحافت آفتاب جہاں تاب کی طرح چمک رہی تھی۔ مولانا آزاد کا 'الہلال' و 'البلاغ' مولانا محمد علی جوہر کا 'کامریڈ و ہمدرد'، مولانا ظفر علی خاں کا 'زمیندار'، لکھنؤ اور دہلی کے کئی اخبارات و رسائل سے ملک بھر میں ایک دھوم مچ گئی تھی۔ مگر اردو زبان کی یہ شمشیر کرناٹک میں گم تھی۔ صاحب موصوف کا احسان ہے کہ انھوں نے صرف الکلام کو جاری ہی نہیں کیا بلکہ مستقل مزاجی سے اس کو تقریباً نصف صدی تک زندہ رکھا۔"

اسی طرح ریاست کی معروف مصنفہ ڈاکٹر حبیب النساء ولی اللہ (مرحومہ) جناب غوث محی الدین اور اخبار 'الکلام' کے صحافتی کردار و ادبی و تعلیمی خدمات کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> "الکلام نے اردو زبان کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مدیر الکلام سید

> غوث محی الدین نے اپنے اخبار کے ذریعے مسلمانوں میں تعلیم کو مقبول عام
> بنانے کی خاص طور سے کوشش کی۔"

بحیثیت مصنف:

درس و تدریس سے شغف اور حد درجہ انہماک آپ کو تصنیف و تالیف کی ڈگر پر لے آیا۔ جب اس میدان میں طبع آزمائی کی تو کم و بیش نصف درجن کتابیں آپ کے قلم سے منصۂ شہود پر آئیں۔ اس طرح آپ کا نام نامی مصنفین کی فہرست میں بھی اونچا مقام رکھتا ہے۔

ٹیچر کالج مدراس سے واپسی کے بعد ہم عصر اساتذہ کے لیے 'جواہر التعلیم' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو علمی حلقہ میں بے حد پسند کی گئی۔ اس کی مقبولیت ریاستی حدود پار کر کے بھوپال اور ممبئی تک جا پہنچی۔ ملک بھر سے اساتذہ برادری نے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ راقم الحروف نے مذکورہ کتاب تک رسائی حاصل کی ہے اور مطالعہ بھی کیا ہے۔

146 صفحات پر مشتمل یہ کتاب بلا مبالغہ آج بھی اساتذہ برادری کے تدریسی مہارت و فن کو جلا بخشنے اور ان کی تدریسی معلومات و آگہی میں بیش بہا اضافہ کی صلاحیت و استعداد رکھتی ہے۔ فن تعلیم و تدریس کے جملہ گوشوں کا اس میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس وقت کے انگریزی ماخذ، ماہرین علوم و فنون کی تحقیقات و تجربات اور دیگر ذرائع سے استفادہ کر کے کتاب لکھی گئی ہے۔ جس کا بین ثبوت خود تصنیف ہے۔ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ انسٹی ٹیوٹ، بنگلور سٹی کے کارخانہ مدینہ پریس سے 1930 میں شائع ہوئی ہے، جو کہ طبع دوم ہے۔ کتاب کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ضرورت تصنیف، اہمیت و دیگر احوال پر خود صاحب کتاب کی تحریر سے بہتر روشنی پڑتی ہے، جو طبع اول و دوم کے دیباچہ میں ہے۔

> "فن تعلیم پر اردو میں اب تک بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور باستثنا چند اکثر
> کتب قدیم طرز تعلیم کے مطابق ہیں۔ حالانکہ انگریزی میں نت نئی کتابیں
> ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر معلمین کو جدید طرز تعلیم اور تازہ معلومات سے
> بہرہ ور کر رہی ہیں۔ چونکہ میری عمر کا بیشتر حصہ اُسی دشت علمی کی سیاحی میں

گذرا ہے۔ اِس لیے مجھے اپنے ہم مشرب دوستوں کی شدید تعلیمی ضروریات
محسوس ہوتی رہی ہیں۔ اور میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک ایسی کتاب مرتب
کروں، جو فنِ تعلیم کے جملہ تازہ اور جدید اصول، قوانین، فلسفہ اور نفسیات پر
بہ خوبی روشنی ڈال کر اساتذہ کے لیے ایک رفیقِ صادق کا کام دے سکے۔

خوش قسمتی سے مجھے ٹیچر کالج سیدا پیٹ مدراس میں ٹریننگ کے لیے دو سال رہنے کا موقع مل گیا، جس کو میں نے نہایت غنیمت تصور کر کے وہاں کے عظیم الشان کتب خانے سے گریگری لٹنا اور بیاگلی جیسے امریکہ کے مشہور و معروف ماہرین فنِ تعلیم کی عمیق تحقیقات اور وسیع تجربات کے انمول موتیوں اور جواہرات کو چن چن کر اپنے ساتھ لایا۔ جن کو تین سال لگا تار دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کے بعد آج ایک تحفہ کی صورت میں اپنے معزز قدر دانوں کی خدمات میں پیش کرتے ہوئے اعزازِ قبولیت کا امیدوار ہوں..... (دیباچہ طبع اول، یکم ستمبر 1927)

کتاب کو جو مقبولیت ملی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تیسرے سال پھر اس کی طباعت کا شدید تقاضا پیش آیا چنانچہ طبع دوم 1930 کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”شکر خدائے کارساز کا کہ ’جواہر التعلیم‘ ہندوستان بھر کے معلمین میں نہایت ہی
مقبول ہوئی۔ میسور، مدراس، ممبئی اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹیوں نے اس کتاب
کو بہ نظر استحسان دیکھ کر اسکول لائبریریوں کے لیے اس کی خریداری منظور
فرمائی۔ (یکم فروری 1930)

مذکورہ بالا تحریر سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ آپ نے کس عرق ریزی و محنت شاقہ سے یہ کتاب لکھی۔ بحث و تحقیق، تصنیف و تالیف ایسا محنت طلب اور عملِ پیہم کا متقاضی عمل ہے، جسے وہی انجام دے سکتا ہے، جس کو جنون کی حد تک اس کام سے شغف اور لگاؤ ہو۔ تین سال کے جہدِ مسلسل کے نتیجہ میں گراں قدر تصنیف کے طور پر جو نتیجہ برآمد ہوا، وہ بے مثل ثابت ہوا اور آپ کو ہندوستان بھر کے علمی حلقے میں ایک نئی شناخت ملی۔ اتنا ہی نہیں، اس تصنیف بیش بہا سے استفادہ کرنے والوں نے اظہارِ تشکر کے طور پر آپ کو ’مصورِ تعلیم‘ کے باوقار خطاب سے سرفراز کیا۔

کتاب کے اخیر میں اساتذہ برادری سے آپ کا ناصحانہ خطاب ہے، جو معاشرہ میں

اساتذہ کی حیثیت و وقار اور قوم و ملت کی تعمیر و ترقی میں ان کے جملہ کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ اندازِ تخاطب پُر زور اور دلسوز ہے، کتاب تک رسائی چونکہ ہر کسی کے لیے نہ تو ممکن ہے، اور نہ بالاستیعاب مطالعہ کے لیے وقت کی قربانی کا وہ جذبہ رہا، چنانچہ درس و تدریس سے جڑے احباب کے استفادہ کے لیے اس خطاب کی شمولیت بطور کفایہ ضروری سمجھتا ہوں۔

'میرے ہم مشرب دوستوں سے خطاب'

اے اساتذۂ کرام! جب ظلم و تشدد کا دور دورہ ہو، جب طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو، جب صفحۂ عالم پر بداخلاقی اور گمراہی کی تیز آندھی چل رہی ہو، جب غلاظت کے زہریلے مواد سے مخلوقات کے دماغ گندے اور ناپاک ہو چکے ہوں، جب جہل و نادانی کے آگے انسانی بصیرتیں سربسجود ہو چکی ہوں، جب فرزندانِ آدم چاہِ عصیاں میں مدہوش پڑے ہوں، جب کفرستانِ ظلمت پر تباہی و بربادی کی گھٹا چھائی ہو تو تم ہی ہو کہ اپنے نورِ ایمان، طاقتِ گفتار، طہارتِ کردار، حُسنِ اخلاق، نواہائے اخوت ریز اور ذہن تعقل خیز سے ایسے بدنما منظر کو گلزارِ ارم بنا دیتے ہو۔ یہی تمھارا کام ہے۔ یہی تمھارا فرض اولین ہے۔ تم اس ماورگیتی میں انسانی زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کو روشن کرتے آئے ہو، تم نیکی کے ڈوبتے سفینے کے ناخدا ہو، تم کفر و عصیاں کے حصارِ استوار کو اپنی پے در پے یورشوں سے مسمار کرتے آئے ہو، تم ہی اسوۂ حسنہ کے مینار کو بداعمالی کے بحرِ بے کراں کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھنے والے ہو!

جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو

از پے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

اے اساتذۂ عظام! تم گلشنِ ادب کی عنادلِ شیریں مقال ہو۔ تمہارے جادوئے زباں سے بھٹکے ہوئے راہ پاتے ہیں۔ تمھارے رخِ مسیحائی سے جہالت کے مردے جی جاتے ہیں۔ تمھارے باطنی نور سے لاکھوں ہستیاں منور ہوتی

ہیں۔تمہاری فسوں خیز موسیقی سے ایک عالم روحانیت کا سبق حاصل کرتا ہے،تمھاری نغمہ ریزیوں سے چمنستانِ علم وتمدّن سر بسر ترنستان بن جاتا ہے۔تمھاری تڑپادینے والی غزل خوانی سے مجنونِ عشق پیشہ لیلائے علم کی تلاش میں بادہ پیمائی اختیار کرتا ہے۔

دنیا تمھاری قدر نہ کرے ،نہ سہی،وہ تمھیں بھول جائے،پروا نہیں۔دنیاوالوں کا ابتدائے آفرینش سے یہی رویہ رہا۔وہ ہر مصلح،ہر مرشد راہ رشد و ہدایت سے ایسا ہی سلوک کرتے آئے ہیں۔تمھاری غربت وافلاس کی وجہ سے سوسائٹی تم سے اپنا منہ پھیر لے تو پھیر لے۔اس کارزارِ ہستی میں کمالات کا ظہور،ہمیشہ غربت وافلاس کے پردے میں ہی ہوتا رہا ہے۔مصائب وآلام تم پر ٹوٹیں،ٹوٹنے دو۔انسانی سیرت ایسی ہی فضا میں کامل نشو ونما پاتی ہے۔امراء ورؤسا تمھیں ٹھکرائیں،ٹھکرانے دو۔تمھاری قوتِ جاذبہ بالآخر انھیں تمھارے حلقۂ غلامی میں کشاں کشاں لے آئے گی۔تم اپنا کام پوری تن دہی اور کامل انہماک سے کیے جاؤ۔تمھارا مطمحِ نظر ہمیشہ بلند ہونا چاہیے۔تم ہر لمحہ عالمِ بالا کی طرف پرواز کرتے ہوئے نظر آؤ۔کبھی عالمِ سفلی کی طرف رغبت نہ کرنا۔یہی تمہارا نصب العین ہے۔یہی مقصدِ زندگی۔تم بنی نوعِ انساں کے سچے ہمدرد اور خدمت گزار ہو۔تم رہبرانِ قوم ہو،تم مذہب وملت کے سرتاج ہو،دیکھنا کہیں پاؤں کو لغزش نہ ہو جائے۔تمھارے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی اور غفلت نمودار نہ ہونے پائے،ورنہ قعرِ مذلّت میں گر کر دائمی لعنت خرید لوگے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر وپرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تندرو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اے اساتذۂ ذی وقار! تم اپنی رگوں میں افلاس وغربت کی خلش محسوس کرتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ دنیا کے اہلِ دل نے بھوک اور برہنگی میں ہی اپنے مقاصد کی کمان کو چڑھتے ہوئے دیکھا۔جس دن جاہ و

جلال، دولت و ثروت تمھیں نصیب ہوئی، تمھاری قوتِ متخیلہ اسی کے آگے سر بسجود ہو جائے گی۔ پھر تم اپنے حقیقی مقصد سے دور جا پڑو گے۔ منعمِ حقیقی کو تم سے ابھی بڑے بڑے کام لینے ہیں۔ تمہیں میدان کارزار میں بڑے بڑے آزمودہ کار بہادروں کا کام بجالانا ہے۔ افلاس کہیں تمھارے ارادوں کو پست نہ کردے، تم کس بات کے شاکی ہو؟ تم انسانی آرزوؤں اور تمناؤں کے مسمار شدہ بُرجوں پر ایسے درخشاں ہو، جیسے شعاعِ خورشید ہزاروں پر۔ تمھیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے۔ تمہیں اپنے کام پر فخر کرنا چاہیے۔ تم قوموں کو بنانے والے ہو۔ تم سے مخلوقات تربیت یافتہ ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہے گی۔ تم اپنی دھُن کے پکّے رہو۔ تم حسنِ عمل کی پیشانی پر وہ درخشندہ لعل ہو، جسکی چمک سے مخلوقِ الٰہی کے دل منور ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ کہیں ذرا سی کوتاہی سے ابدی ذلّت نہ خرید لینا۔ دنیا کے اہم ترین امور میں سے سب سے زیادہ اہم امر تمھارے ہی ذمّے پڑا ہے۔ اسکی اہمیت کا پاس تم پر لازم ہے۔ دنیا کے بہترین فرائض میں سے بہترین فرض تم پر ہی عائد ہوا ہے۔ اس کی انجام دہی کے لیے سرتاپا کوشش درکار ہے۔

اے اساتذۂ ذی وقار! تم پُر فضا وادیوں میں نئے پودوں کی آبیاری پر مُتمکّن ہو۔ ان کو کہیں پژمردہ نہ کرو۔ دنیا یہی تمہارے پھولوں کی مہک سے بلبل رطبُ اللّسان ہو کر نغمہ آرائیاں کریں گے۔ یہی تمھاری روحانیت کے اثر سے متاثر ہو کر چرخِ حوادث کو سیپارہ کر دیں گے۔ یاد رکھو! اگر تمھارے غنچے پورے طور پر شاداب نہ ہوئے تو بادِ صرصر کے جھونکے ان کی پتّیاں بکھیر دیں گے۔

جب انسانی روح زنگ آلود ہو جائے گی تو ان کے صیقل کرنے کے لیے دنیا تمھارے ہی دروازے کھٹکھٹائے گی۔ تم ہی ان کی بیماری کا تیر بہ ہدف علاج کر سکو گے۔ تم ہی ان کی کُلفتوں کو ابرِ رحمت کے آبِ زلال سے دھو

ڈالو گے۔ تم ہی ان کے قلوب کو توہمات کی غلاظت سے پاک کر کے مثل بلور صاف وشفاف کر دو گے۔ دیکھو تمھارا کام کس قدر عظیم الشان! تمہارا فرض کیسا جلیل القدر! کیا تم کو اس پر ناز نہیں؟ پھر شکوہ وملال کیسا؟

تم بعض دفعہ اس امر سے کپکپا اٹھتے ہو کہ دنیا والے تمھیں بہ نظر تحسین نہیں دیکھتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا والوں نے پیغمبروں، رسولوں، مہاتماؤں کو کب اپنی نظروں میں وقعت دی۔ پھر تم جو ان کی خاک پا ہو، اور حقیقتاً ان ہی کے کام کو سنبھالے ہوئے ہو، کیوں ایسے اوہام سے رنجیدہ خاطر ہوتے ہو۔ تمھارے پاکیزہ کام کو دیکھ کر وہ خود بخود گرویدہ ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن تمھارے اعلیٰ ترین کام کی شان کے خلاف ہے کہ تم کو خراج تحسین کا خیال لاحق ہو۔ تمھارا اضمحلال، تمھاری سراسیمگی اگر اسی لیے ہے تو تم نے اپنی حقیقت کو نہیں پہچانا۔ تم کو تو بےنفس ثابت ہونا چاہئے۔ تم میں اعلیٰ اخلاق کے جوہر کثیر حصّہ میں پائے جانے چاہئیں۔ خوب یاد رکھو کہ تم غیر فانی ذات کی آغوشِ محبت میں پلے تھے۔ تم غیر فانی کمالات کے مظہر ہو۔

اے مُعلّمین! آؤ اور متحد ہو کر اپنے فرائض کی تکمیل کے لیے پورے طور سے کمربستہ ہو جاؤ۔ معلم بنو۔ مگر سچے معنوں میں خود کو بہترین علوم وفنون، اخلاق واوصاف سے مزیّن کرو۔ نہ صرف یہ بلکہ ان خوبیوں کو عملی جامہ پہناؤ۔ اپنے آپ کو پہچانو۔ اپنے جذبات وحسیات کی جانچ پڑتال کرتے رہو۔ دنیا تم نے فتح کر لی۔ دنیا والے تمہارے سامنے جھک گئے۔ یقین جانو کہ دنیا کے تمام گروہوں میں سے تم ہی ایک ایسے گروہ ہو، جن کے آگے بڑے بڑے جابر بادشاہ، سنگ دل حکمراں اور سرکش ہستیاں جھک جاتی ہیں اور جھکتی رہیں گی۔ اگر تم ایسا نہیں پاتے، تو نقص تم میں ہے۔ ان نقائص کو دھو ڈالو۔ پھر دیکھو کہ کبھی نہ کبھی تمھاری تُربت پر سخت سے سخت کٹر کے آنسو چھلک نکلیں

گے۔ اور وہ کہہ اٹھے گا کہ

نکہتِ گل سے معطر ہوگیا میرا دماغ نورِ عرفاں نے فروزاں کردیا دل کا چراغ
لے لیا تیرے تخیل نے مجھے آغوش میں لا بٹھایا مجھ کو موجِ نغمۂ خاموش میں
تیرے آئینے میں کیا صورت نظر آئی مجھے میری ہستی کی حقیقت تو نے دکھلائی مجھے

مذکورہ خطاب دلنواز کو کتاب 'جواہر التعلیم' کا ماحصل اور کتاب کی عدم دستیابی واستفادہ سے محرومی کی صورت میں صرف اس خطاب کے مطالعہ کو تلافی و کفایہ سمجھنا چاہیے۔ خطاب کا ناصحانہ اسلوب، زبان وبیان کی سلاست ، الفاظ کی موزونیت، معنویت کی ترسیل وتبلیغ، موضوع کی اہمیت ،خطیب کی انکساری، مخاطب کی قدردانی ،خودی کی پہچان کی ترغیب، غیر ذمہ داری کی ترہیب، غیرت وحمیت کی للکار، مال ومنال کی آس سے خبردار، یہ سارے عناصر اس خطاب میں بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ قوی امید ہے کہ علم دوست احباب خصوصاً درس وتدریس سے وابستہ حضرات اس سے مستفید ہوں گے اور محظوظ بھی۔

آپ کی تالیفات میں ایک کتاب 'تحفۂ عید' ہے۔ موضوع پر معلومات کا خزانہ ہے۔ نو بہ نو مضامین اس میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا بھی راقم نے مطالعہ کیا ہے۔ کتاب دراصل تین کتابچوں 'تحفۂ عید'، 'بانگِ درا' اور 'عید کا تحفہ یا علمی پھولوں کا گلدستہ' کا مجموعہ ہے۔ پہلا کتابچہ نثری ہے، جس میں عید سے متعلق وقت کے ممتاز مضمون نگاروں کے مضامین ملتے ہیں، بانگِ درا دلچسپ نظموں پر مشتمل ہے۔ خصوصاً مولانا حالیؒ کی رباعیات اور علامہ اقبالؒ کا شکوہ جواب شکوہ شامل ہے۔ جبکہ کتاب کا آخری حصہ عید کا تحفہ موضوع سے متعلق نظم ونثر پر مشتمل ہے۔ کتاب شوکت الاسلام پریس، لشکرگاہ سے طبع ہوئی ہے۔ جس کے مالک یم عبدالرحمٰن تاجر کتب، ومدیر اخبار 'اڈورڈ گزٹ (1901) تھے۔ کتاب کے ابتدائیہ میں عید کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے قارئین سے اس طرح مخاطب ہیں۔

عید آئی کیا دل اہل زمانہ شاد ہے ہر جگہ جشنِ طرب ہر سو مبارکباد ہے

ہم بغل باہم نہ کیوں کر مومنین ہوں شاد شاد   قیدِ غم سے آج احسن ہر کوئی آزاد ہے

اخیر میں لکھتے ہیں:

''میرے پیارے دوستو!   لو یہ موتیوں کی مالا، تمھارے زیب گلو کرلو۔ اگر تم ان موتیوں کی قدر کرو اور اپنے دل میں حفاظت سے رکھو تو میں سمجھوں گا کہ تم تمام نے مجھے بھی عید کے دن ایک بے نظیر تحفہ دیا۔

جہاں میں خوش و خرم وشاد رہنا   بفضل خدا دیر آباد رہنا

(تمھارا دیرینہ دوست یم سید غوث محی الدین)

اس دور میں میسور اسٹیٹ میں اردو مدارس کے لیے اردو کتابیں بھی کم یاب تھیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کا بیڑا بھی آپ نے اٹھایا اور تقریباً بیسیوں اردو کی درسی کتابیں لکھیں۔ اکثر کتابیں محکمہ تعلیمات سے منظور ہو کر نصابِ تعلیم کا حصہ قرار پائیں۔ بعض تحریروں کے مطابق بعض کتابوں پر انعام بھی ملے۔

آپ کی دیگر معروف تصنیفات میں تاریخ ہند، آئینہ، جغرافیۂ میسور، جغرافیہ طبعی، یہ بتا کے کیوں میری مٹی خراب کی، کے علاوہ اردو مدارس کے لیے سب سے پہلے میسور اسٹیٹ کا بڑا دیواری نقشہ تیار کرنے کا سہرا بھی آپ کے سر جاتا ہے۔ جسے سارے اردو مدارس میں حکومت کی جانب سے تقسیم کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں کنڑی زبان میں 'جغرافیائی اٹلس' کی اشاعت بھی آپ کے ہاتھوں انجام پائی، جو کنڑی اسکولوں میں رواج پایا۔

اردو انگریزی میں طبع آزمائی

آپ اردو زبان کے اچھے شاعر مانے گئے ہیں۔ خصوصاً مزاحیہ کلام اردو حلقہ میں بے حد پسند کیا گیا۔ انگریزی میں بھی نظمیں لکھنے کی مشق رہی ہے۔ ایک مرتبہ بنگلور کی ایشیوافریکن گڈول سوسائٹی میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے خیر مقدم میں عربی بحر میں آپ نے جو انگریزی نظم تحریر کی تھی، اسے سن کر پنڈت جی خوب محظوظ ہوئے اور دہلی آکر ان کے مہمان ہونے کی دعوت دی۔ اسی طرح آپ سری لال بہادر شاستری، سابق گورنر میسور جنرل ناگیش، ہز ہائی نس مہاراجہ

میسور سری نجلنگپا سابق چیف منسٹر میسور کے متعلق جو انگریزی نظمیں لکھی تھیں، وہ بہ نظر استحسان دیکھی گئیں۔ اس پر ان شخصیات نے توصیف کے خطوط بھی ارسال کیے۔

بنگلور میں اوّلین برقی پریس اور اشاعتی خدمات

پریس (چھاپہ خانہ) کے ذریعہ اسلامی کتابوں کی نشر واشاعت اور فروغ کی مختلف کوششیں بھی بابائے صحافت کی کتاب زندگی کا ایک اہم باب رہا ہے۔ جو خاص دلچسپی کا باعث ہے۔ مدیر الکلام سید غوث محی الدین نے زبان وادب، علوم وفنون کی آبیاری نہ صرف بحیثیت معلّم، مصنّف اور صحافی کی، بلکہ ناشر وطابع کی حیثیت سے بھی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ جب کتابیں اونچی اونچی قیمتوں میں فروخت ہورہی تھیں، اور باذوق احباب کتابوں کی گرانی کے سبب حصول سے محروم دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے حالات میں غوث صاحب نے اولین برقی پریس شہر میں لاکر کتابوں کی ارزاں قیمت میں فراہمی اور کتابوں کی کثیر تعداد میں نکاسی کا راستہ ہموار کیا۔ بطور خاص ایسے دور میں جب طباعت کے وسائل وذرائع کی ایسی بہتات نہیں تھی، جس قدر آج ہے۔ جو کام 25 روپیوں میں دو دن کے عرصہ میں ہوا کرتا تھا، اب وہی کام برقی پریس میں صرف دس روپے کی لاگت اور ایک گھنٹے میں ہونے لگا۔ اس طرح بابائے صحافت کے اس انقلاب آفریں کارنامہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتابوں کی قیمتیں گھٹ گئیں اور مناسب داموں میں کتابیں فراہم ہونے لگیں۔ اس جدید تکنیک کے ذریعہ پوری ریاست میسور میں اردو زبان وادب اور دینی کتابوں کی ترویج واشاعت کی گویا شاہراہ کھل گئی۔ سٹی مارکیٹ میں 'کارخانہ مدینہ پریس' آپ کی ملکیت تھی۔ اور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ انسٹی ٹیوٹ، بنگلورسٹی، بھی آپ کا تھا۔ اس ادارہ کے ساتھ کتاب تحفۂ عید کے سرورق پر 'ہاسن' درج ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید پہلے ہاسن میں یہ قائم رہا ہو۔

پریس کی اجمالی تاریخ

فنِ صحافت اور پریس دونوں کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ صحافت کی تاریخ پریس سے پہلے کی ہے۔ جب پریس وجود میں نہیں آیا تھا، تب تک ہاتھ سے لکھے ہوئے اخبارات کی روایت

تھی۔ ہاتھ سے لکھا ہوا پہلا اخبار چین میں 1911 قبل مسیح وجود میں آیا، جس کا نام کین بان (Keen (Bon تھا۔ اس کے بعد یورپ سے 58 قبل مسیح ایکٹا ڈیلرنا اخبار نکلا۔ اس کی نقل اور نسخے تیار کرنے کے لیے بڑی تعداد میں نسخہ نویس مقرر رہتے۔ پھر عہد اوسطیٰ میں جب جہاز رانی کو فروغ حاصل ہوا، اور عالمی تجارت کی چہل پہل بڑھی تو مختلف ملکوں کے بڑے شہر درآمد و برآمد کے مرکز بننے لگے تو تجارتی اور دیگر معلومات کی اشاعت کے لیے ان قلمی اخبارات کا دور دورہ شروع ہوا اور سرکاری سرپرستی سے آزاد ہو کر یہی قلمی نسخے دینی وغیر دینی جماعتوں کے ترجمان کی حیثیت سے بھی وجود میں آنے لگے۔

1436 میں چھاپہ خانہ کی ایجاد نے صحافت کو پرواز کے 'پَر' لگا دیے۔ اور صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد کا سہرا جرمن سائنس داں گوٹن برگ (Guten Berg) کے سر جاتا ہے۔ جس کی موجودہ ترقی یافتہ صحافت رہینِ منت ہے۔ تاہم ابتدا میں پریس کا استعمال صحافت کی بجائے کتابوں کی اشاعت کے لیے کیا گیا۔ بعد میں پریس اور صحافت کا ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کا لازمی جُز بن گئے۔ لیکن یہ بات آج کے دور میں صدفی صد صادق نہیں آتی، چونکہ انفارمیشن ٹکنالوجی نے ای پیپر (E-paper) کی سہولت بہم پہنچا کر صحافت کو ایک حد تک پریس سے آزاد کر دیا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی سے انگلینڈ، فرانس اور ہولینڈ سے مطبوعہ اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ جس کا سلسلہ رفتہ رفتہ لندن اور امریکا تک جا پہنچا۔ یورپ میں صحافت کی عہد بہ عہد ترقی میں پریس کی ترقیوں نے کلیدی رول ادا کیا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں پریس ترقی کر کے اس شکل پر پہنچا کہ ریل کے انجن کے مانند بھاپ سے چلتا تھا۔ اس پریس کو بھی جرمن کے سائنس داں Koeng نے ایجاد کیا تھا۔ یہ ایک گھنٹہ میں 1100 کاپیاں چھاپتا تھا۔ پھر 1885 میں لینوٹائپ پریس کی حیرت انگیز ایجاد نے طباعت کے میدان میں ایک اور انقلاب کو دستک دی۔ اس مشین نے ہاتھ سے حروف جمع کرنے اور ترتیب دینے سے چھٹکارہ دلا کر لکڑی اور پھر دھات پر کٹائی کر کے تصویروں کے بلاک تیار کرنے کا رواج دیا۔ جس کے نتیجہ میں اخبارات تصویروں سے مُزیّن ہو کر شائع ہونے لگے۔ پریس کی ترقی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اور ٹکنالوجی کے اس دور

میں ترقی کے عروج پر ہے۔

پریس کی دستک شمالی ہند میں

انگریزوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں ہی اردو زبان کی ضرورت واہمیت کا اندازہ کرلیا تھا۔ جس کے بعد فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا۔ اس سے اردو کی باقاعدہ تعلیم کا دروازہ کھلنے کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ لہٰذا ان کتابوں کی اشاعت کے لیے اردو ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔

غرض 1814 میں لکھنؤ، 1830 میں کانپور اور 1835 میں دہلی میں پریس قائم ہوئے۔ اس طرح 1837 کے بعد سے 1849 تک ہندستان کے تمام بڑے شہروں میں پریس قائم ہو چکے تھے۔ اور اردو کی شجر میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں تھیں۔

پریس کی دستک جنوب میں

> ''ریاستِ میسور میں دہلی اور لکھنؤ کے دوش بدوش اردو زبان کے مطابع کے قیام اور اور اس کے ساتھ ہی اخبارات و رسائل کی اشاعت کا عمل بھی جاری رہا۔ چنانچہ قیام بنگلور (1811 مطابق 1226 ھ) کے بعد معسکر بنگلور میں سب سے پہلے مطبع فردوسی 1847 مطابق 1246 ھ میں قائم ہوا۔ اس کے بعد قائم ہونے والے مطبعے کی فہرست میں مطبع طلسم کرتان، مطبع نبوی، چامراج پریس، مطبع بحر العلوم، مطبع قدوسیہ، مطبع حقانی، مطبع منشور محمدی، مطبع رضوی، مطبع بحر العلوم، مطبع شوکت الاسلام،، مطبع نقشبندیہ، قلندریہ اور علوی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جو 1900 تک موجود تھے۔''

(بحوالہ: کوثر، شمارہ ستمبر 1935)

اس کے علاوہ گورنمنٹ پریس میں کولمبین، ویلسین مشن پریس، رومن کیتھولک پریس، کرناٹک پریس، وچار درپنا پریس، کرشنا راجہ پریس، باقی پریس، سلطان پریس وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

بنگلور میسور میں پریس کے اس طویل تاریخی پس منظر میں بنگلور سٹی میں یس غوث محی الدین صاحب نے سب سے پہلے لیتھوگرافک پریس متعارف کرایا، جس سے اشاعت کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ جہاں کام سرعتِ رفتار سے ہونے لگے، کتاب کی قیمتیں بھی آسمان سے زمین پر آ گئیں۔ نتیجہ کے طور پر ریاست بھر میں کتابیں سستے داموں میں فراہم ہونے لگیں۔ اردو کی ترویج وترقی کا جو کام انجام پایا، وہ ریاست بھر میں عدیم المثال مانا جاتا ہے۔

اس اجمال کی قدرے تفصیل میں جاتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ' کارخانہ مدینہ پریس یا' الکلام برقی پریس' سے کون کون سی قابل ذکر کتابیں شائع ہوئیں۔

1) کلام ربانی کا مستند اردو ترجمہ:

اردو داں طبقہ کے استفادہ کے لیے آپ نے قرآن مجید کا مستند اردو ترجمہ بنام' کلام ربانی' ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے نہایت ارزاں قیمت میں اسے عوام تک پہنچایا۔ راقم الحروف نے اس ترجمہ کی تیسری اشاعت کا ایک نسخہ دیکھا ہے۔' الکلام برقی پریس' بنگلور سٹی سے 1360ھ مطابق 1914 میں شائع ہوا ہے۔ 365 صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ہے۔

2) قرآن مجید کا اولین کنڑی ترجمہ:

یہاں کی عموی زبان کنڑ ہے لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ خصوصاً اضلاع اور دور دراز کے علاقوں میں لوگ اردو سے نابلد ہیں۔ اس طبقہ تک پیغام خداوندی پہنچانے کے لیے کنڑی زبان میں مکمل قرآن پاک کا ترجمہ شائع کیا جو 1950 تک کہیں بھی یہ عمل دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ غوث محی الدین صاحب نے اس کار خیر کو انجام دے کر ایک اشد ضرورت کی تکمیل فرمائی۔ صوبہ بہار کے سابق گورنر اور کنڑی زبان کے مشہور ادیب سری ڈاکٹر آر آر دیواکر نے بیش قیمت پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ سارے کنڑی جاننے والوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اظہار تشکر کیا۔

ترجمہ کے منظر عام پر آتے ہی انگریزی اور کنڑی اخبارات میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ حکومتِ میسور نے ملک میسور کے تمام کالجوں، ہائی اسکولوں، مڈل اسکول اور لائبریریوں گاؤں، پنچایتوں میں اس ترجمہ کی کاپیاں خریدنے کے احکام

صادر کیے۔اس پر مستزاد آپ کی قدر دانی اور عزت افزائی کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیوں کا انعام بھی پیش کیا۔

علاوہ ازیں شاہ سعودی عربیہ نے اس ترجمہ کا ایک نسخہ قبول کر کے سکریٹری کے ذریعہ بطور حوصلہ افزائی ایک ہزار روپے کا چیک آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

3) جنانُ السّیر فی احوال سیّدِ البشر:

حضرت شاہ عبدالحیٔ معروف بہ احقر بنگلوری (متوفی 1887) کی مقبول ترین تصنیف جنانُ السّیر جو سیرت کے موضوع پر اردو کی مقبول عام کتاب ہے۔جس کی شہرت کا عالم یہ تھا کہ جنوبِ ہند کا شاید ہی کوئی گھر ہو جس میں اس کتاب کا ایک نسخہ موجود نہ ہو۔جنوبِ ہند کے لوگ اپنی بیٹیوں کو جہیز میں قرآن مجید کے ساتھ لازمی طور پر یہ کتاب دیا کرتے تھے۔یہ کتاب اس دور میں عوامی ضرورت بن چکی تھی۔بازار میں دس تا بارہ روپیوں میں دستیاب تھی۔مہنگائی کے سبب غریب لوگوں کی پہنچ اس کتاب تک مشکل ہو رہی تھی۔چنانچہ آپ نے اس بیش بہا تصنیف اور ضخیم کتاب کی ہزاروں کاپیاں شائع کیں اور صرف ایک روپیہ ہدیہ میں فراہم کر کے مسلمانان کرناٹک کو محوِ حیرت کر دیا۔امامی صاحب مرحوم کی تحریر کے مطابق الکلام برقی پریس سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور کولار کے معروف ماہرِ تعلیم شاہ ابوالحسن ادیب کولاری کی کتابیں بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں۔

غرض آپ نے بحیثیت ناشر و طابع اردو زبان و ادب اور علوم و فنون کو علم دوست احباب تک ارزاں قیمت میں پہنچا کر اس کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیا جو آپ کی جملہ مساعیٔ جمیلہ اور خدماتِ جلیلہ کی سنہری کڑی ہے۔

سیاسی و ملّی خدمات:

میسور ریپرزنٹیٹیو اسمبلی کے رکن:

بنگلور سٹی کے مسلمانوں کی طرف سے زیادہ سے زیادہ ووٹ پا کر میسور ریپرزنٹیٹیو اسمبلی

کے رکن منتخب ہوئے اور پانچ سال تک مسلمانوں کی سیاسی میدان میں نمائندگی کی۔

میسور قانون ساز کونسل کی رکنیت:

قومی اور ملکی امور میں آپ کی ذمہ دارانہ شراکت اور حصہ داری دیکھ کر حکومتِ میسور نے آپ کو میسور قانون ساز کونسل (لجسلیٹو کونسل) کی رکنیت دی۔ آٹھ سال تک اس کے ممبر رہے۔

بنگلور سٹی میونسپل کونسل کی رکنیت:

بنگلور سٹی کے میونسپل الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوکر میونسپل کونسل کی رکنیت حاصل کی۔ کونسل کے جملہ ممبران نے باتفاق رائے آپ کو کونسل کا نائب صدر منتخب کیا۔ نو ماہ بعد حکومت کی طرف سے کونسل کے صدر بنا دیے گئے۔ آپ کا دور صدارت تھا جس میں بنگلور سٹی کی جامع مسجد کی زمین اہل اسلام کے سپرد کرنے کا معاملہ پیش آیا۔ اس موقع پر آپ کی پُر جوش اور ولولہ خیز تقریر سے متاثر ہوکر ممبران نے مسجد کی زمین اہل اسلام کو دینے کا متفقہ فیصلہ کیا۔

قومی و ملی اداروں سے وابستہ خدمات

رکن صدر انجمن مسلمانان ملک میسور:

آپ اس کے عرصہ دراز سے دائمی رکن رہے۔ پھر اس ادارہ کی مجلس منتظمہ کے ممبر اور نائب صدر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ اس دوران خاں بہادر محمد عباس خاں مرحوم کی رہبری آپ کو حاصل رہی۔ ☆ مجلسِ ملیہ اسلامیہ بنگلور کے رکن تاسیسی رہے۔ ☆ بنگلور میں انجمن ترقی اردو کی سب سے پہلے شاخ کھولی اور بحیثیت سکریٹری اردو کی ترقی کے لیے ملک بھر میں جدوجہد کی۔ ☆ آل میسور اسٹیٹ اردو کانفرنس کے آپ سکریٹری رہے۔ مرکزی بیت المال، بنگلور سٹی کے سرگرم کارکن رہے ☆ میسور اسٹیٹ بورڈ آف وقفس کے رکن کی حیثیت سے ادارے کی ترقی و تنظیم میں قابل ذکر خدمات انجام دیں ☆ مسلم لائبریری کے تقریباً ربع صدی سے لائف ممبر رہے ☆ میسور اسٹیٹ جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے لائف ممبر رہے۔ اور ایک سال تک اس ادارہ کے صدر بھی رہے۔ اس دوران گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ☆ ہاسن میں جرنلسٹس کانفرنس کے نام سے صحافیانِ ریاست میسور کی طرف سے منعقدہ جلسے کی صدارت آپ نے کی۔ ☆ میسور اسٹیٹ پرنٹرس ایسوسی ایشن کے لائف ممبر اور صدر بھی رہے۔ ☆ ولبھ بھائی پٹیل انسٹی ٹیوٹ

آف لنگویجز کے سرگرم کارکن اور ڈائرکٹر تھے۔ ☆ہاؤز بلڈنگ کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹڈ معسکر بنگلور کے بانیوں میں سے تھے۔ بحیثیت ڈائرکٹر بھی خدمات انجام دی ہیں۔ ☆خلاصی پالیم کی مسجد میں واقع مدرسہ کے صدر رہے۔

درج ذیل سرکاری وغیر سرکاری کمیٹیوں میں نمائندگی:

میسور پریس اڈوائزری کمیٹی ☆مسلم اسکالرشپ کمیٹی ☆مائی تھک سوسائٹی ☆کنڑا ساہتیہ پریشد ☆یونائٹڈ لاڈج آف تھیاسوفش ایشوافریکن

اعزازات وخراج تحسین

کلیم الملک کا خطاب

عرصہ دراز پر محیط آپ کی علمی وصحافتی خدمات کے اعتراف میں سید عبدالواجد صاحب سبزواری، ریونیو کمشنر کی زیر صدارت منعقد ایک پروقار تقریب میں پوری قوم کی طرف سے 'کلیم الملک' کا خطاب دیا گیا۔

حکومتِ میسور کی جانب سے اعزازی وظیفہ دیے جانے پر خیر خواہوں کی طرف سے مبارکبادی وسپاسنامہ:

> محترم کلیم الملک! حکیم الامت ڈاکٹر اقبالؒ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے آپ نے اپنے قلم سے ملک وملت کی یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے جرنلزم میں اتنی سیاہی خرچ کی ہے کہ شاید کسی نے اتنا پیا نہیں ہوگا۔ آپ کا قلم ہر معرکہ اور مرحلہ میں رواں دواں رہا۔ صحافتی زندگی میں آپ نے ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔ آپ نے اردو کی شمع اس وقت پر روشن کی جبکہ ساری ریاست میسور میں کوئی اردو اخبار نہیں تھا۔ آپ کے اخبار 'الکلام' کو جنوبی ہند میں عموماً اور ریاست میسور میں خصوصاً اولیت کا فخر حاصل ہے۔ اس حیثیت سے بھی بجا طور پر آپ بابائے صحافت ہیں۔
>
> بیدار مغز حکومت میسور کی طرف سے آپ کے لیے تاحیات ماہوار اعزازی وظیفہ کی پیشکش اس پیرانہ سالی میں بھی آپ کی جواں ہمتی، استقلال اور

اولوالعزی قابلِ ستائش ہے۔غم میں مسکرانا اور طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا یہ وہ خوبی ہے، جس کو روح الصفات کہہ سکتے ہیں ۔

جواں مردوں کے جوہر تو مصیبت ہی میں کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

سید والا صفات! آپ کی ادبی، ثقافتی اور صحافتی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کرتے ہوئے بیدار مغز حکومتِ میسور نے آپ کے لیے تا حیات جو بیش بہا اعزازی وظیفہ منظور کیا ہے۔اس قدر افزائی پر ہم حکومتِ میسور کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ کو پُر خلوص مبارکباد دیتے ہیں کہ حق بہ حقدار رسید۔ ہماری دلی دعا ہے کہ ربُّ العزّت آپ کو مدّتوں صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے اور آپ کا فیضان اردو اور اردو اخباری دنیا پر جاری رہے۔

مدت درازباد کہ تا دور مشتری　ماز تو برخوریم　و نوازعمر　برخوری

اس موقع پر آپ کی شان میں پیش کیا گیا منظوم کلام بعنوان
'وظیفہ یاب ہوئے محترم کلیم الملک'
طبع زاد جناب حسان سخن محمد عبداللہ صاحب شوق، جناب ڈاکٹر حکیم عبدالمستقیم خاں دانش
و جناب ابوالکلام صاحب شاد زیبائی

شریک بزم جو ہیں محترم کلیم الملک　　تو پیشوائی کو حاضر ہیں ہم کلیم الملک
گدائے خواجۂ کونین ُہیں محی الدین　　غلام سید عرب و عجمؐ کلیم الملک
صحافیانِ وطن میں قدیم تر ہستی　　وجود آپ کا ہے مغتنم کلیم الملک
پچاس سال کی تاریخ خدمت اردو　　کرے گی تجزیہ کیف و کم کلیم الملک
یہاں صحافت اردو میں قبل نصف صدی　　اٹھایا آپ نے پہلے قلم کلیم الملک
زبان کنڑی میں قرآن کی اشاعت کی　　یہ کارنامہ ہے سب سے اہم کلیم الملک
جنوبی ہند میں خدمت جو 'الکلام' نے کی　　چراغ راہ ہے نقشِ قدم کلیم الملک
ہے یہ بھی حضرت اقبالؒ کی نظر کا فیض　　ہیں وقف خدمتِ علم و قلم کلیم الملک
حوادثاتِ زمانے سے ہو کے بے پرواہ　　رہے ہمیشہ ہی ثابت قدم کلیم الملک

شہید سید غفار سے جو ہے نسبت — ہیں آپ وارث سیف و قلم کلیم الملک
رہے وطن کے لیے کانگریس سے وابستہ — رکھا ہے قوم کا یوں بھی بھرم کلیم الملک
کھلائے آپ نے کاغذ کے ایسے گل بوٹے — ہے صفحہ صفحہ جواب ارم کلیم الملک
اداشناس سیاست کلیم طور کلام — جریدہ آپ کا ہے جامِ جم کلیم الملک
شریک ڈپٹی منسٹر ہیں صدر اوقاف بھی — یہ کیا ہے آپ کا اقبال کم کلیم الملک
یہ واقعہ ہے کہ آیا جو کوئی حاجت مند — بڑھا ہے آپکا دستِ کرم کلیم الملک
یہ شہسوار صحافت اگرچہ ہے بوڑھا — وہی ہے آج بھی زورِ قلم کلیم الملک
زمین مسجد جامع کی سعیٔ پیہم پر — خدادے اس کی جزا محترم کلیم الملک
نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز — یہی ہے مقصدِ لوح و قلم کلیم الملک
جو قدر دانی حکومت نے آپ کی کی ہے — تو اس کرم کے ہیں ممنون ہم کلیم الملک
دعا ہے آپ پہ ہر وقت سایہ گستر ہو — خدائے پاک کا فضل و کرم کلیم الملک
یہ نظم ہدیہ ہے از شوق و شاد و دانش بھی — وظیفہ یاب ہوئے محترم کلیم الملک

مشاہیرِ وقت کے توصیفی خطوط و عزت افزائی

جدید میسور کے معمار امین الملک سر مرزا محمد اسماعیل آپ کے بڑے قدر داں تھے۔ جب تک میسور اسٹیٹ کے دیوان کے باوقار عہدہ پر فائز رہے، اور جو انگریزی تقاریر آپ نے اہل اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کی تھیں، اس کے اردو تراجم آپ (غوث صاحب) ہی کو تفویض کیے جاتے رہے۔ جب عہدہ دیوانی سے مورخہ 30/مئی 1941 کو اسماعیل صاحب سبکدوش ہوئے۔ آپ کی ادبی، علمی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایک اعلیٰ درجہ کی سند عطا فرمائی۔ ذیل میں آپ کا اخبار 'الکلام' کے صحافتی کردار کے اعتراف میں مرسلہ خط ملاحظہ ہو۔

دیوان میسور
کارلٹن ہاؤس، بنگلور
مورخہ: 30/5/1941

میں روزنامہ 'الکلام' کے ایڈیٹر جناب سید غوث محی الدین صاحب کو بخوبی جانتا ہوں۔ الکلام ہی وہ واحد اخبار ہے، جو ریاست میں گذشتہ اٹھارہ سال سے جاری ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ الکلام حکومت کے ساتھ پوری طرح متحد رہ کر میسور اسٹیٹ کے بہترین مفادات کے مدنظر پیہم وفاداری اور عقیدت مندی سے ضروری خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ جناب محی الدین پبلک کی دیگر مفید خدمات بھی انجام دیتے آرہے ہیں۔ وہ چند اردو کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ جن کی وجہ سے اسلامی حلقوں میں ان کو مقبولیت و شہرت حاصل ہے۔

میں جناب محی الدین صاحب اور الکلام کے لیے سالہائے آئندہ بھی مزید ترقی اور کامیابی کا متمنی ہوں۔ (دستخط) مرزا ایم اسماعیل

عزت مآب جے چامراجین راوڈیر مہاراجہ میسور اور گورنر میسور اسٹیٹ کے پرائیوٹ سکریٹری کی طرف سے اظہار خوشی کا خط

P.H. 3/51-52

دی پیالس میسور

مورخہ 24/03/1952

عالی جناب

14/ ماہ رواں کو آپ کا مرسلہ خط اور آپ کا بھیجا ہوا پوتر قرآن کا ایک خصوصی مجلد نسخہ ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس مقدس کتاب کو شائع کرنے کے لیے جو سعی فرمائی ہے، وہ نہایت ہی قابل تعریف ہے۔ جس پر ہز ہائی نس کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔

آپ نے ہندو کلچر اور فلاسفی کے متعلق جن کتب کے ہندستانی زبان میں ترجمہ کرنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے، اس کو سن کر ہز ہائی نس کو مسرت ہوئی۔ آپ نے بھگوت گیتا کا ترجمہ ہندستانی زبان میں کرنے کا جو عزم ظاہر کیا ہے، اس میں

آپ کی کامیابی کے لیے ہز ہائی نس آرزومند ہیں۔

آپ کا صادق...... (دستخط) داراشاہ...... ......پرائیوٹ سکریٹری

سری ایس نج لنگپا، بی اے یل یل بی

رکن پارلیمنٹ اور صدر کرناٹکا پردیش کانگریس کمیٹی

سابق وزیر اعلیٰ میسور اسٹیٹ و موجودہ صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس، دہلی کی جانب سے مبارکبادی

چترِ درگ

مورخہ 6-2-1954

جناب غوث محی الدین صاحب کی خدمت میں نمسکار

آپ نے از راہ مہربانی کنڑی پوتر قرآن کی ایک جلد جو روانہ فرمائی، اس کے مطالعہ سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ بہت سے اہم امور کو معلوم کرنے اور دیگر معلومات کو حاصل کرنے میں مجھے بڑی مدد ملی۔ قرآن شریف کا سلیس کنڑی زبان میں ترجمہ شائع کر کے آپ نے کنڑی زبان جاننے والوں پر احسان کیا ہے۔ میری آرزو ہے کہ کنڑی جاننے والے تمام احباب اس ترجمہ کو پڑھ کر مستفید ہوں۔

حضور پیغمبر اسلامؐ نے انسان کی فلاح و بہبودی کے لیے جو راستے بتلائے ہیں، وہ ماضی اور مستقبل دونوں کے لیے سراسر مفید ہیں۔

کنڑی زبان جاننے والوں کے استفادہ کے لیے آپ نے جو ترجمہ شائع کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ دوبارہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

ایس نج لنگپا

میسور اسٹیٹ پرنٹر ایسوسی ایشن کی جانب سے عزت افزائی

ہز کسلنسی گورنر میسور نے 10 راگست 1968 رشنبہ کی صبح کو جے نگر میں منعقد میسور اسٹیٹ پرنٹرس ایسوسی ایشن بنگلور کی سلور جبلی تقریب کے سنہرے موقع پر آپ کی عزت افزائی

قیمتی دوشالے سے کی۔ آپ ایسوسی ایشن کے بانیان اور فعال صدر بھی رہ چکے ہیں۔

آپ کی وفات 15 ر اکتوبر 1970 مطابق 1390 ھ کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔ 80 سال عمر پائی۔ بڑا مکان نزد لال باغ میں مدفون ہیں۔ وارثین میں سید امتیاز احمد، سید ریاض الدین اور پوتہ سید تاج الدین ہیں۔

ماخذات:

☆ کتابچہ بعنوان ’کلیم الملک حضرت سید غوث محی الدین (مرحوم و مغفور) کی حیات و خدمات: ناشر رخشندہ پبلسٹی، بنگلور

☆ ماہنامہ ’کوثر‘ شمارہ 10 ر ستمبر 1935 — زیر ادارت محمود خاں محمود

☆ ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما — :از ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ولی اللہ

☆ مصر کی عربی صحافت — :از محسن عثمانی

☆ نقوش ہی تاثرات — :از حکیم محمد امامی

☆ ارمغانِ سالار (مجموعہ مضامین) — :از پروفیسر بی شیخ علی، میسور

ممتاز شیریں

کرناٹک کی طویل ادبی تاریخ جن تخلیق کاروں اور بے لوث خدمت گذاروں سے عبارت ہے، ان میں مرد حضرات کے شانہ بشانہ خواتین کی بیش بہا خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر دور میں متعدد خواتین میدان ادب سے وابستہ رہی ہیں، اور نظم و نثر کے مختلف اصناف کے ذریعہ یہاں کے ادبی ورثے کو مالا مال کرتی رہی ہیں۔ ان میں شہر بانو شاکرہ، عقیلہ بیگم، عائشہ بیگم، رقیہ بیگم، صفیہ بی حیا اور رقیہ بی کنیز کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل دور سے جن خواتین نے اپنے پیشرو خواتین خدمت گذاروں کی جگہ لی اور اس کار عظیم کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر لیا، ان میں ڈاکٹر حبیب النسا بیگم ولی اللہ، آمنہ خاتون وغیرہ کے نام ادبی افق پر ملتے ہیں۔ گرچہ خواتین تخلیق کاروں کی تعداد نسبتاً رہی ہے، لیکن مقامی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ان کے کارناموں کا چرچا ملتا ہے۔ قومی ادبی سرمایے کے فروغ میں ان کی حصہ داری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بیسویں صدی کی انہی معدودے خواتین میں قابل رشک ادیبہ ممتاز شیریں اس مضمون کا عنوان ہیں، جو بیسویں صدی کے نصف اول دور سے ثلث تک ہند و پاک کے ادبی افق پر نیر تاباں بن کر درخشندہ رہیں۔ ممتاز شیریں، جو کہ دو صفتوں سے مرکب نام ہے، میدان ادب میں امتیاز پا کر اور ذاتی اوصاف میں شیریں مقال اور خوش اطوار ہو کر ممتاز اور شیریں کا حسین سنگم ثابت ہوئیں۔

وہ 12/ستمبر 1924 کو بنگلور میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام قاضی عبدالغفور خاں اور والدہ کا نام نور جہاں تھا۔ ابتدائی تعلیم میسور میں اپنے نانا ٹیپو قاسم خاں کے زیر سایہ حاصل کیا خصوصاً مذہبی و اخلاقی تربیت ان سے پائی۔ بنیادی تعلیم کے بعد انھیں ایک انگریزی اسکول میں داخل کیا گیا جہاں سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔ 1941 میں بنگلور کے مہارانی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق کے حامل صمد شاہین سے شادی ہوئی۔ ممتاز شیریں بھی اردو ادب کا نفیس ذوق رکھتی تھیں۔ شیریں بچپن سے ہی بڑی زیرک اور کتاب کا کیڑا ثابت ہوئی تھیں۔ بچپن سے ہی اردو جرائد و رسائل کے مطالعہ کا شوق ان میں گھر کر گیا تھا۔ نیرنگ خیال، ہمایوں، مدینہ اور انقلاب کے علاوہ سالک کے افکار و حوادث جیسے معیاری رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ تھا۔

''ادب سے لگاؤ کے متعلق ممتاز شیریں اپنی ایک نامکمل آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

''اباجان میرے لیے ایک دوست تھے۔ وہ آزاد خیال اور وسیع المشرب واقع ہوئے تھے۔ وہ مجھے پڑھنے لکھنے سے نہیں روکتے تھے۔ کتابیں کہیں سے مانگ تانگ کر چھپ کر پڑھنے کی مجھے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اچھی ادبی کتابیں وہ خود لایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب میں نو دس برس کی تھی، وہ میرے لیے مرزا سعید کی کتابیں، شرر اور راشد الخیری کے ناول اور منشی پریم چند کی ساری کتابیں لے آتے تھے۔ اس دور کے معیاری ادبی رسائل بھی منگواتے تھے۔ یوں مجھ میں بچپن ہی سے اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔''

ان رسالوں کے مطالعہ نے جہاں اردو زبان و ادب کی لذت سے انھیں روشناس کرایا وہیں ان کی فکر و آگہی اور ذہنی پختگی میں مہمیز کا کام کیا۔ اس کے علاوہ ان رسالوں نے ان میں کچھ طفلانہ تخیلات کو بھی جنم دینا شروع کیا، اور وہ عجیب عجیب خواب دیکھنے لگیں۔ کسی میگزین کے ایڈیٹر کی حیثیت و مرتبہ کا خیال ان کے دل و دماغ میں ایک عظیم المرتبت انسان کے روپ میں ابھرنے لگا۔ مثلاً ایڈیٹر ہونا کتنی بڑی بات ہے، کیا وہ بھی بڑی ہو کر اس مقام کو پہنچ سکتی ہیں، کیا اس کے پاس اتنے روپے پیسے ہو سکتے ہیں کہ وہ خود کوئی رسالہ نکال سکیں وغیرہ۔

پروردگار نے شیریں کے بظاہر طفلانہ تخیلات اور ان کے خوابوں کی تعبیر کا سامان صمد شاہین کے انتخاب میں رکھا، جو نہ صرف ان کے رفیق حیات بنے، بلکہ ان کے خوابوں کا شہزادہ ،ادبی سفر میں بہترین ہم سفر، جلوت وخلوت میں جمالِ ہمنشیں، خوشی وغم میں ہمدرد وغمگسار اور زندگی کے نشیب وفراز میں مرشد ورہنما تک ثابت ہوئے۔

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ صمد شاہین سے ان کا رشتہ طے پانے میں دونوں کی ادب پرستی، فکر وخیال اور ذوق کی ہم آہنگی اور شوق مطالعہ کو خاص دخل تھا۔ غرض دونوں نے اردو زبان و ادب سے اپنے اٹوٹ رشتہ کو نباہنے اور ذوق کی تسکین کے لیے 1944 میں اردو ماہنامہ رسالہ 'نیا دور' جاری کیا، جو 1952 تک پابندیٔ وقت سے شائع ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ 1947 میں جب ملک تقسیم سے دوچار ہوا اور ممتاز شیریں کو اپنے شوہر صمد شاہین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کرنی پڑی، تو وہاں بھی نیا دور اسی آب وتاب سے شائع ہوا۔ ہندوپاک کے اردو حلقوں میں اس رسالہ کی خوب پذیرائی ہوئی اور محبان اردو کے دلوں کی دھڑکن اور ذوق کی تسکین کا سامان بنا رہا۔ 1948 میں پاکستان سے 'فسادات نمبر' کی اشاعت 'نیا دور' کی تاریخ کا انوکھا تجربہ تھا، جو ادبی حلقے میں بے حد پسند کیا گیا۔ وقت کے بڑے بڑے ادیب ونقاد نے اپنے توصیفی خطوط بھیج کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ممتاز شیریں کا اس رسالہ کی ادارت واشاعت کے عمل میں کیا حصہ داری اور اشتراک عمل رہا، اس کے ذکر کے بغیر مضمون تشنہ رہے گا۔ اس لیے اس کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا۔ ان کا یہ کردار اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مشہور زمانہ افسانہ نگار اور بلند پایہ نقاد ومبصر ہونا، ان کے مسلم الثبوت ادبی حیثیت وعظمت کو اجاگر کرتا ہے۔ نظیر صدیقی جو پاکستانی نژاد معروف خاکہ نگار ہیں، کا ممتاز شیریں سے والہانہ تعلق رہا ہے۔ نظیر صدیقی نے ممتاز شیریں پر بھی خاکہ لکھ کر اپنے والہانہ عقیدت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ ممتاز شیریں کے عمدہ اخلاق، واطوار اور علمی کمالات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> "ممتاز شیریں نہایت خوش مزاج، خوش اخلاق، خوش طبع اور گوشہ نشیں خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور گہری علمیت کا لوہا بہت ہی کم عمری

میں منوالیا تھا۔ وہ ادب میں یقیناً ایک تند جبیں نقاد تھیں، لیکن ان میں علمی رعونت نام کو نہ تھی۔ انھیں اپنی رایوں پر نہ صرف اعتماد تھا بلکہ اصرار بھی۔"

ممتاز شیریں بلند پایہ فنکار تھیں، اپنے افکار و خیالات کے اظہار میں جری اور بے باک تھیں، اپنے نظریہ کی تبلیغ بھی پوری شدّت سے کرتی تھیں۔ لیکن انھیں اپنے اس علمی رتبہ اور فنی مہارت کا زعم بالکل نہیں تھا۔ گھر کی چہار دیواری میں ایک شریف الطبع خاتون کی حیثیت سے ہی رہیں۔ رہن سہن میں وہی سادگی، مزاج میں عاجزی و انکساری، نمود و نمائش سے کوسوں دور، صوم و صلٰوۃ کی پابند نیک سیرت اور پاک طینت خاتون بن کر رہیں۔

نظیر صدیقی ان کی علمی شخصیت اور ذاتی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ان میں وہ منکسر المزاجی تھی، جس کی توقع ان کی تحریروں سے نہیں ہوتی۔ اپنی تحریروں میں پر اعتماد اور تحکمانہ انداز رکھتی تھیں، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں منکسر المزاج ہونے جیسی خوبی مجھے ان کی ذات میں نظر آئی، ویسی کسی اور شخصیت میں نظر نہ آسکی۔"

ممتاز شیریں کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے شوہر صمد شاہین کے روبرو محض ایک سلیم الطبع فرماں بردار بیوی بن کر رہیں، نہ کبھی ان کی مرضی پر اپنی خواہش کو فوقیت دینے کی کوشش کی اور نہ ان کی ترجیحات میں دخل اندازی کی سوچی۔ انھوں نے اپنے شوہر کی خوشی و خوشنودی کا ہر ممکن خیال اور پاس و لحاظ رکھا۔ کبھی بھی علمی و ادبی حیثیت کا قبا پہن کر خود کو برتر یا ہمسر ثابت کرنے کا نہیں سوچا۔

نظیر صدیقی نے ممتاز شیریں کے خاکہ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ انھیں کس قدر اپنے شوہر کے مزاج کی شگفتگی کا خیال رہتا تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

" کئی سال کی خاموشی اور گوشہ گیری کے بعد پچھلے سال انھوں نے ریڈیو پاکستان پنڈی کا ایک پروگرام قبول کیا، جس میں ان کا انٹرویو لیا گیا تھا۔ جب وہ اس پروگرام کے لیے ریڈیو اسٹیشن گئیں تو اپنا قلم وہیں بھول آئیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ریڈیو اسٹیشن جاتے رہتے ہیں، اب کی

جائیں تو فلاں صاحب سے کہیے گا کہ ان کی میز پر میرا قلم رہ گیا تھا۔ میں نے کہا'' آج کل تو میرا جانا نہیں ہوتا۔ میں فون پر کہہ دوں گا۔'' انھوں نے کہا '' خیر آپ فون پر ہی بات کر کے میرا قلم منگوا دیں، ویسے میں شاہین صاحب سے بھی ریڈیو والوں کو کہلوا سکتی تھی۔ لیکن قلم بہت اچھا ہے، اگر اس وقت تک ضائع ہو چکا ہے تو شاہین صاحب کو بڑی کوفت ہوگی۔ اس لیے میں ان سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتی۔''

ادبی خدمات کے ذکر میں ممتاز شیریں کے سر کئی اہم کام کی انجام دہی کا سہرا جاتا ہے۔ خاص طور سے دنیا کی مختلف زبانوں کے ادبی سرمایوں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سمت میں پیش رفت ممتاز شیریں نے کی تھی، لیکن ان کے تشنہ کام کو محمود ایاز نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ غرض یہ کہ ممتاز شیریں کو مطالعہ کا ذوق وشوق جنون کی حد تک تھا، مطالعہ کا جو چسکہ بچپن میں لگا تھا، آخری دم تک رہا۔ اردو کتابوں کے علاوہ مغربی ادب کے مطالعہ میں انھیں خاص دلچسپی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی ادب کا کورس کیا تھا، اس کورس نے انگریزی ادب سے ایک خاص لگاؤ اور انسیت پیدا کر دی تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ صمد شاہین کے پاس مغربی ادب کی عمدہ لائبریری تھی، جس میں ہزاروں کی تعداد میں جدید مغربی ادب کی تمام اہم کتابیں موجود تھیں۔ اس سے ان کا شوق دو آتشہ ہو گیا۔ انگریزی ادب میں انھیں جو زبان کی چاشنی، فکر وفن کا توازن، خیالات کی وسعت اور ذہنی کشمکش کا مشاہدہ ہوا تھا، اس سے اردو داں طبقہ کو بھی محظوظ کرانے کا ارادہ کیا۔ اسی خیال نے انھیں انگریزی کے منتخب افسانوں کا اردو میں ترجمہ کی طرف مائل کیا۔ اس کام کو ممتاز نے سنجیدگی سے لیا اور ان ترجموں کے ذریعے اردو ادب کے ذخیرہ میں گراں بہا اضافہ کیا، اس کے لیے اردو دنیا کو ممتاز شیریں پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

موصوف خاکہ نگار نظیر صدیقی نے ممتاز شیریں کے اردو وانگریزی میں علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے بعض مسودات کی نشاندہی کی ہے، جو ہنوز توجہ طلب ہیں۔ نظیر صدیقی رقم طراز ہیں:

"ممتاز شیریں اپنی زندگی کے آخر کے چند برسوں میں زیادہ سرگرم عمل نہ ہونے

کے باوجود کئی مسوّدات چھوڑ گئی ہیں، جن میں ایملی برونٹی اور چیسٹر ناک سے متعلق دو کتابیں انگریزی میں ہیں۔ منٹو پر ان کی کتاب ناتمام ہونے کے باوجود اس وقت تک منٹو کا سب سے زیادہ تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ انھوں نے اپنے بہترین افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ جو ایک مقدمے کے ساتھ مرتب شکل میں موجود ہے۔ ان کے مسوّدات میں ایک نامکمل خود نوشت بھی ملی ہے، جو پندرہ بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ 1947 کے فسادات کے متعلق بہترین افسانوں کا مجموعہ انھوں نے مرتب کیا، جس پر ایک طویل مقدمہ بھی لکھا۔ ممتاز شیریں کی دو چیزیں ایسی ہیں جو اگر چہ ان کی زندگی میں شائع ہوئیں مگر ان کی طباعت عدم طباعت کے برابر ہے۔ کیونکہ وہ دونوں چیزیں شائع ہونے کے بعد کہیں ڈال دی گئیں۔ ان میں سے ایک تو اسٹین بک کے ایک ناول کا اردو ترجمہ ''در شہوار'' ہے۔ جس کے مقدّمے میں انھوں نے امریکی ناول کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ دوسرے منتخب امریکی افسانوں کا اردو ترجمہ ہے۔ جس پر ان کا ایک طویل مقدمہ ہے۔ جو بڑی محنت سے لکھا گیا تھا۔ ممتاز شیریں نے دنیا کی مختلف زبانوں کے بہترین افسانوں کا اردو ترجمہ خاصی تعداد میں شائع کیا ہے۔ ان ترجموں سے ایک اچھی کتاب بن سکتی ہے۔ رسالوں میں ان کے بکھرے ہوئے مضامین ہیں جن سے ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔''

یوسف عارفی (مرحوم)، مرتب 'ممتاز شیریں' سلسلہ یادرفتگاں (مطبوعہ 2009 زیر اہتمام کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور) نے کتاب ہذا کے مقدمہ میں ممتاز شیریں کی جملہ علمی خدمات اور فنی پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ نظیر صدیقی کے جائزہ میں جو پہلو گرفت میں نہیں آسکے تھے، اس میں اس کا احاطہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا ان کے جائزہ کا درج ذیل اقتباس بہت سے مخفی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ طوالت کے خوف سے اجمالاً ہی پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یوسف عارفی رقم طراز ہیں کہ:

''ممتاز شیریں نے کل پندرہ افسانے لکھے، جو ان کے دو افسانوی مجموعے 'اپنی

نگریا' اور 'میگھ ملہار' میں شامل ہیں۔اسی طرح کل اٹھارہ تنقیدی مضامین لکھے، جن کا مجموعہ 'معیار' کے نام سے شائع ہوا ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں کہ جن دنوں ممتاز شیریں کی تخلیقی سرگرمیاں عروج پر تھیں، ان ہی دنوں عالمی ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا جارہا تھا۔ جب منٹو نے بہت پہلے روسی کہانیوں کو اردو کا جامہ پہنانے کے بعد اردو افسانہ لکھنے کا آغاز کیا تھا۔عزیز الدین، میراجی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے ساتھ ممتاز شیریں نے بھی تراجم کی جانب توجہ دی۔ ولیم فاکنر، ہیمنگوے، میل ویلہنری جیمس اور ڈریزر جیسے مشہور اور اہم ناول نگاروں کے فن پر شاندار مضامین لکھے۔

ناول کے علاوہ انھوں نے افسانوں کے بھی ترجمے کیے، میخائل شولوخوف کا مشہور افسانہ 'فادر' کا ترجمہ باپ کے نام سے کیا۔ نٹ ہمین کی کہانی The call of life کا ترجمہ بڑی عمدگی سے کیا ہے۔

ممتاز شیریں نے چینی، روسی، نارویجین، امریکی، اطالوی اور اسٹرین افسانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً کنڑ، اڑیہ، مرہٹی اور بنگلا کہانیوں کے بھی ترجمے کیے ہیں۔ ان کے ترجموں کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ یہ بالکل آسان اور دلنشیں زبان میں ہوتے تھے۔"

ممتاز شیریں کے ادبی کارناموں میں ان کا یہ کارنامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں کا نہ صرف بالغ نظری اور ادبی وفنی معیار کی کسوٹی پر رکھ کر جانچا پرکھا بلکہ معاصر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا آپسی موازنہ بھی کیا۔ جہاں کہیں نقص محسوس کیا، برجستہ انداز میں مفید مشوروں سے نوازا اور ان فن پاروں پر بھر پور تبصرے بھی کیے۔ راقم السطور نے ان کے اس نوعیت کے ایک مضمون کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں اپنی ہم عصر ادیبہ ہاجرہ مسرور کا افسانہ 'تیسری منزل' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ وتبصرہ اس شرح وبسط سے کیا ہے کہ پاکستان سے شائع شدہ رسالہ 'نیا دور' کے پندرہ صفحات پر مبسوط ہے۔

ممتاز شیریں کی فنی بصیرت، تحلیل وتجزیہ کے ہنر کا اندازہ ہاجرہ مسرور کے متعلق درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔

"میاں بیوی یا مرد وعورت کے آپس میں تعلقات کے علاوہ بھی ہاجرہ

مسرور نے دوسرے اہم انسانی رشتوں کا سراغ لگایا ہے۔ چنانچہ پرانی نسل اور نئی نسل کا رشتہ...... یہ تعلق بھی عجیب سا ہے۔ جس میں آپس میں گہری محبت رکھنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کو نہیں سمجھتے۔ 'ہائے اللہ' کی بوڑھی دادی اپنی پوتی نُھی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ لیکن دادی کی بروقت کی روک ٹوک اس کے معصوم احساسات کو یکسر سنجیدہ اور تجسس آمیز بنادیتی ہے۔ اور دادی کے قبل از وقت اندیشے دس، گیارہ سالہ نُھی کی معصومیت کو بری طرح مجروح کردیتے ہیں۔ 'نئے پرانے' کے حکیم رحمت اللہ اپنی رحم ولی، رواداری سوجھ بوجھ اور پدرانہ شفقت کے باوجود نئی نسل کے بدلے ہوئے تقاضوں کو بالکل سمجھ نہیں پاتے۔ وہ اپنے دوست کی یتیم لڑکی راشدہ کو نہایت محبت سے پالتے ہیں۔ لیکن جب چودہ سالہ راشدہ کسی جھوٹی شرم وحیا کے بغیر ایک سبق کے دوران میں یہ کہہ دیتی ہے کہ اسے لفظ 'زنا' کے معنی معلوم ہیں، یہ برا کام ہے۔ تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نئی روشنی کی راشدہ اخلاقی اعتبار سے کتنی گرگئی ہے۔ انھیں یہ مطلق احساس نہیں ہوتا کہ راشدہ کے اس جملے میں سادگی اور معصومیت ہے۔ وہ مکرم اور راشدہ کے گہرے لیکن معصوم تعلق کو بھی نہیں سمجھ پاتے۔ اور یہ نہ سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو مسلسل کرب واذیت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں میں ہاجرہ مسرور نے ایسے مطالعے پیش کیے ہیں، جو ان کی نفسیاتی باریک بینی، ژرف نگاہی کا ثبوت دیتے ہیں۔''

اسی تبصرہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں

''ہاجرہ مسرور میں ایک خصوصیت ایسی ہے، جس کی وجہ سے وہ دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے الگ ہیں۔ اور وہ ہے ان کی (ناول کے کرداروں سے) مکمل علاحدگی اور معروضیت۔''

کچھ ممتاز شیریں کے افسانوں کا پس منظر.................خود ان کی زبانی

ممتاز شیریں اپنے عہد کی ممتاز اور مایہ ناز افسانہ نگار تھیں۔ فن پر عبور حاصل تھا۔ شیریں نے افسانہ نگاری کو فنی اور تکنیکی اعتبار سے عروج بخشا ہے۔ معاصر نقاد اور مبصرین نے ان کے

فن کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا ہے مثلاً یوسف عارفی نے ممتاز شیریں کے بارے میں محمد حسن عسکری کا یہ قول نقل کیا ہے:

"ممتاز شیریں اردو کی ان چند لکھنے والوں اور لکھنے والیوں میں سے ایک ہیں، جن کی تعریف ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔ انھیں مشہور ہونے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ پہلے ہی افسانے کے بعد انھوں نے ادب کے شائقین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی"

ممتاز شیریں کے فن کا ادبی دنیا میں کافی چرچا رہا ہے، اور خواص کے حلقوں میں ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر نقد و تبصرہ ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔ لیکن ممتاز شیریں نے بتدریج اپنی ادبی نشو و نما، فنی ارتقا اور افسانہ کے منظر و پس منظر سمیت اس کے کرداروں کا بذات خود جائزہ لیا ہے۔ ادبی و فنی اعتبار سے ان کا یہ جائزہ خود احتسابی معلومات کا ایک مرقع ہے، جو دیباچہ نقشِ ثانی کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اگر کوئی ادیب اپنا احتساب اپنے الفاظ میں بیان کرے، اور اس میں اس کی دلی کیفیت، ذہنی کشمکش کا بیان ہو تو وہ دوسروں کے تبصرے و تنقید سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، خود پڑھنے والوں کے لیے اس میں زیادہ کشش ہوتی ہے۔ لہٰذا ممتاز شیریں کے ذاتی جائزہ پر مشتمل مضمون کے منتخب اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، تا کہ خود ان کی زبانی ان کے فن کے بارے میں جانا جا سکے۔

چنانچہ وہ لکھتی ہیں

''بعض لوگوں کی رائے ہے 'میرے اندر دو شخصیتیں ہیں۔ ایک افسانہ نگار اور دوسری نقاد۔ آپس میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ علاحدہ نہیں کی جا سکتیں۔'
یہ افسانے لکھتے وقت مجھے اپنے نقاد ہونے کا ہمیشہ احساس رہتا ہے۔ اور میرے افسانوں پر ناقدانہ شخصیت حاوی رہتی ہے۔
مجھے اس رائے سے پوری طرح اتفاق نہیں کیونکہ میرے بیشتر افسانے تخلیقی رو میں وجدانی کیفیت کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ بہت سے عناصر جو غیر شعوری طور پر میرے افسانوں میں شامل ہو گئے ہیں، ان کا احساس مجھے اس وقت ہوا

ہے، جب میں ان افسانوں کا تجزیہ کرنے لگی ہوں۔ اپنے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسی شرح وبسط کے ساتھ اس لاتعلقی اور معروضیت سے اپنی تحریروں کو بھی جانچ سکوں جیسے میں دوسرے فنکاروں کی تحریروں کا جائزہ لیتی رہی ہوں۔ اس وقت میری نقادانہ حیثیت پوری طرح عمل میں آتی ہے۔ یعنی نقاد کے محدب شیشے سے افسانے کے جزئیات اور لوازمات واضح اور الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ورنہ فنکار کے ذہن میں افسانہ ایک مکمل اکائی کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ ویسے ان دونوں شخصیات یعنی افسانہ نگار اور ناقد کا آپس میں ربط ورشتہ ہے اور غیر محسوس طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ افسانہ لکھتے ہوئے ادب کا تنقیدی مطالعہ کام میں آتا ہے۔ اور تنقید لکھتے ہوئے فنکار کے تخلیقی عمل کا تجربہ۔

بہر حال میں نے پہل افسانہ نگاری سے کی تھی۔ "اپنی نگریا" کے افسانے اس وقت لکھے، جب میں ابھی باقاعدہ نقاد نہیں بنی تھی۔ افسانے سب کے سب " تقسیم سے پہلے " سترہ سے اکیس سال تک کی عمر میں لکھے گئے تھے۔ اور جب میں نے اپنے پہلے تین افسانے "انگڑائی"، "آئینہ" اور " گھنیری بدلیوں میں" لکھے۔ میں نے ابھی تنقید لکھنی شروع بھی نہیں کی تھی۔ گو اس وقت بھی شاید تنقیدی شعور اور اچھے بُرے کی تمیز مجھ میں نہ تھی۔

فنکار کے ذہن میں افسانہ ایک مکمل اکائی بن کر جنم لیتا ہے۔ چنانچہ افسانہ کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے میرے ذہن میں مکمل فنی تشکیل پا لیتا ہے۔ خواہ وہ انگڑائی کی سی معصومیت اور فطری بے ساختگی لیے ہوئے ہو خواہ کفارہ کا سا Sophisticated افسانہ ہو، میں شعوری طور پر افسانہ کی تکنیک دوسری جزئیات اور لوازمات کا پلان کر کے نہیں لکھتی، بلکہ اندرونی تقاضوں کی بنا پر افسانہ اپنا ایک خاص مزاج پا لیتا ہے اور ایک خاص فنی ہیئت میں ڈھل جاتا ہے۔

چنانچہ انگڑائی کی تکنیک اور پیشکش مجھے ایک خواب میں سجھائی دی۔ میں نے یہ

سارا خواب جوں کا توں الفاظ میں منتقل کر دیا۔ اور خواب سے زیادہ لاشعوری کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے؟۔ گویا وہ فطری حیاتیاتی نشوونما اور اہم نفسیاتی تبدیلی جو لڑکی کی شخصیت کو یکسر بدل دیتی ہے۔ اور جس کا اسے خود شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ ایک خواب کی صورت میں واضح ہو گئی۔ گو انگڑائی میں اس خواب کو حقیقت کی شکل دی گئی ہے۔

انگڑائی میرا سب سے پہلا افسانہ ہے۔ اور سب سے زیادہ مقبولیت بھی اسی افسانہ کو حاصل ہوئی ہے۔ ہر ادبی انتخاب میں عموماً یہی افسانہ لیا گیا ہے۔ میرے چند افسانوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، فرانسیسی، ڈچ، عربی، ہندی، گجراتی، اور بنگالی) انگریزی اور بنگالی میں تقریباً سبھی افسانوں کے ترجمے ہو چکے ہیں (لیکن انگڑائی ہی ایک ایسا افسانہ ہے، جس کا ترجمہ سوائے عربی کے ان سب زبانوں میں ہوا ہے۔ ہمارے ایک فرانسیسی دوست ،موسیئیل اپیٹرنے، جو بنکاک میں ہمارے ساتھی تھے۔ اور جنھوں نے انگڑائی کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے، یہ کہا ہے" آپ کے افسانوں میں "انگڑائی" فرانسیسی مزاج کے لیے سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ انگڑائی کی خوبی اور کشش اس میں مضمر ہے کہ اس میں ذرا سی بھی مصلحت اندیشی نہیں برتی گئی۔ ایک نہایت نازک موضوع کو بغیر کسی اخلاقی جھجک کے پوری فنکارانہ معروضیت سے نبھایا گیا ہے۔ باوجودیکہ آئینہ اس سے گہرا افسانہ ہے، اسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس پر ایک اخلاقی لبادہ اوڑھایا گیا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والی انسانی سرشت میں شر کی موجودگی سے آگاہ ضرور ہے۔ لیکن وہ اس شر کو چھوتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

موت کا تصور " آئینہ " میں کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ جیسے جیمس جوئس کے شاہکار افسانے "دی ڈیڈ" میں ہوتا ہے۔ دی ڈیڈ میں افسانہ نگار کے آغاز سے گیبرئیل

کی انا کی تعمیر ہوتی ہے۔ جس پر موت کے تصوّر سے ایک کاری ضرب لگتی ہے۔ حالانکہ یہاں موت ایک رقیب کی موت ہے۔ موت کے احساس سے جذبہ رقابت احساس برتری اور انانیت سمٹ جاتے ہیں۔ اور گبرئیل کے دل میں ایک نیا ہمدرد جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو اپنی ہمہ گیر وسعت میں سب کو لپیٹ لیتا ہے۔ زندوں کو، مردوں کو، ساری نسل انسانی کو، ساری کائنات کو اور گبرئیل افسانہ کے آغاز والا گبرئیل نہیں رہتا۔ اس کی انانیت آفاقیت میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

جب میں نے یہ کہا ہے کہ " آئینہ " میں موت کا تصوّر جیمس جوائیس "دی ڈیڈ" کی نوعیت کا ہے تو اس سے مطلب یہ نہیں کہ میں نے یہ افسانہ جوئیس کے افسانہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ آئینہ میں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھا تھا، اور اس وقت میں نے جوئیس کو پڑھا بھی نہیں تھا۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں تخلیقی طور پر کسی بھی مغربی ادیب سے متاثر نہیں ہوں، نہ میں نے کسی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اور نہ کسی کا انداز اختیار کیا ہے۔

انگڑائی اور آئینہ کی نوخیز لڑکی ایک منزل اور آگے بڑھتی ہے۔ گھنیری بدلیوں میں "وہ ایک محبت کرنے والی بیوی اور نئی ماں ہے۔ زندگی کی ساری خوشیاں اسے میسّر ہیں۔ لیکن ایک احساس تنہائی ہے۔ جو گہرے بادل کی طرح اس کے وجود پر چھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں چند لمحوں، ایک موڈ، ایک عارضی کیفیت کو گرفت میں لایا گیا ہے۔ عسکری صاحب کی رائے میں یہ افسانہ تکنیکی اعتبار سے سب سے زیادہ صاف ستھرا ہے۔ یہ سارا افسانہ گویا ایک ذہنی ڈراما ہے، جس میں خیالات کی کشمکش ہے۔ خیالات اور تصورات کی متضاد لہریں آگے بڑھتی ہیں، اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ اور اس ذہنی طوفان اور ہلچل کے بعد آخر میں مکمل سکون اور طمانیت کی کیفیت میں چھا جاتی ہے۔

یہاں میاں بیوی کی محبت جنسی تعلق پر مبنی نہیں، بلکہ انسانی تعلق پر، جو جنسی تعلق سے کہیں زیادہ استوار چیز ہے۔ گھنیری بدلیوں میں ایک خصوصی تجربہ یوں

عموی بن گیا ہے کہ کسی بھی نئی بیاہی محبت کرنے والی بیوی کی کہانی ہو سکتی ہے۔ جسے شوہر کی چھوٹی چھوٹی مصروفیتیں بھی اپنی رقیب معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور ذرا دیر کی جدائی اسے بے چین اور مضطرب کیے دیتی ہے۔ لیکن جب میاں بیوی صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں، ہم ذوق، شریک کار اور انھیں ایک ہی لگن ہو تو پھر تنہائی کا احساس مٹ جاتا ہے، گہری رفاقت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور کام ہی گویا محبت کا عکس بن جاتا ہے،

یہ نوجوان نئے بیاہے میاں بیوی جن کے لیے ادب پہلی محبت ہے، چھوٹے سے سرمایے سے ایک ادبی رسالہ نکالتے ہیں، جس کی حیثیت کاروباری نہیں، نوجوانی کے جوش اور ولولے میں وہ یہ عزم کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے اصولوں پر قائم رہیں گے، اور اپنے ادبی رسالے کے معیار کو کبھی گرنے نہیں دیں گے۔ (افسانہ 'اپنی نگریا' اسی کی ترجمان ہے)

یہ اپنے نیا دور کی کہانی ہے، جو افسانوی جامہ پہنائے بغیر براہ راست واقعیت کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کم سنی کا وہ زمانہ تھا کہ ادیبوں مثلاً عسکری، یا احمد علی یا بیدی کے مضامین اور افسانے تو درکنار، خطوط پا کر بھی، بے انتہا خوشی ہوتی تھی۔ اب اپنی نگریا لکھنے کے اتنے عرصے بعد وہ معصوم سی ترنگ کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ افسانہ اپنی نگریا کی حیثیت محض ہنگامی ہے، تاہم یہ افسانہ دوسرے افسانوں کے ساتھ) انگڑائی، آئینہ گھنیری بدلیوں میں (جگہ نہیں پا سکتا، جن میں خصوصی تجربہ حقیقت کے ایک پہلو کا عکس بن گیا ہے۔ یہاں یہ ذاتی تجربہ تک محدود رہتا ہے۔ فنکار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک خصوصی تجربہ کو معروضی اور جمالیاتی ہیئت دے اور فن کار کی ذاتی سچائی تشکیل پا کر آفاقی حقیقت کا ایک جز بن جائے"

اس سے قطع نظر ہر افسانہ نگار اپنی انفرادیت نمایاں رکھنے کے لیے خود کو سماج کے کسی ایک طبقہ، علاقہ، یا جنس کا نمائندہ اور مترجم بنا لیتا ہے۔ اسی کے اطراف اس کی تخلیقات گردش کرتی

ہیں، اور وہی اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ مثلاً بطور خاص افسانوی ادب میں کرشن چندر نے کشمیر کی حسین وادی اور وہاں کے مکینوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ عصمت چغتائی نے متوسط طبقہ کے مسلمان لڑکیوں کی ترجمانی کی ہے۔ سعادت حسن منٹو نے طوائفوں اور متنوع جنس کے شکار کرداروں کا تجزیہ کیا ہے، اشک نے ہندوؤں کے متوسط طبقہ کو اپنایا ہے تو بلونت سنگھ نے پنجاب کے دیہاتوں اور اس کے دلکش فطری مناظر کو پیش کیا ہے۔ اور دیوندر ستیارتھی نے مختلف صوبوں، زبانوں کے گیت اور خانہ بدوشوں کی زندگی سے اپنے افسانے کو وجود بخشا ہے۔

لہٰذا اس چوکھٹے میں ممتاز شیریں بھی عصمت چغتائی کی صف میں نظر آتی ہیں۔ چونکہ ان کے یہاں بھی جو مسائل زیر بحث آئے ہیں، وہ متوسط طبقہ کے صنف نسواں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہاجرہ مسرور کی طرح نئے نئے رشتوں کی تراش اور اس کا بتدریج نشو و نما پھر اپنے انجام کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔ ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں خود اپنی زندگی کو اس خوبصورتی سے برتا ہے کہ وہ افسانہ کی شکل میں سوانح حیات بن گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں بچپن سے لے کر عہد شباب اور پھر نئی نویلی دلہن کے روپ تک کے کردار میں پیش کیا ہے۔

اس خیال کا اظہار دیگر ناقدین نے بھی کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر ابوبکر عباد کا خیال ہے کہ جس طرح ممتاز شیریں کے مرکزی نسوانی کرداروں میں خود ممتاز شیریں کی زندگی کی مختلف ادوار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، ویسے ہی ان کے مرکزی کرداروں میں ان کے شوہر صمد شاہین کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

غرض ان کے افسانے زیادہ تر ان کی ذاتی زندگی کے طرح اور ایسے کا عکس ہیں۔ ان کا افسانہ 'آئینہ' بچپن میں نانی بی کے ساتھ گذرے خوشگوار لمحات، ان سے قصے کہانیاں سننے کے ایام پُر بہار کی یاد تازہ کرتا ہے تو افسانہ 'گھنیری بدلیوں میں' عہد شباب اور ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام کا ذکر دلچسپ پیرایہ میں ملتا ہے۔ اپنی نگریا ان کی علمی و صحافتی کردار کی عکاس ہے۔ جس میں انھوں نے نیا دور کی ادارت و اشاعت میں اپنے اشتراک عمل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ جبکہ کفارہ ان کے ذاتی سانحہ پر مبنی کہانی ہے، جو بنکاک میں قیام کے دوران پیش آیا تھا۔

ممتاز شیریں کا نظریہ فکر

ممتاز شیریں اپنے عہد کی ممتاز ادیبہ، نقاد اور افسانہ نگار تھیں۔ ان کی ادبی و فنی حیثیت کو

اردو دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ادب کے تئیں ممتاز شیریں کا نقطۂ نظر جس قدر واضح اور پُر اعتماد تھا، اس کے پیرایۂ اظہار میں بھی وہ اتنی ہی بے باک وجری تھیں۔ادب پر کسی تحریک، تنظیم سیاسی پارٹی یا خاص مکتب فکر کا تسلط ہو، اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔اس نظریہ کی پرزور مخالفت کی۔عالمی ادب کا بہ نظر غائر جائزہ لیا اور حالات و واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ادب پر پہرا بیٹھانے اور ادیب کے اظہارِ خیال کی آزادی سلب کر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب اپنی اصل روح کے ساتھ باقی نہ رہ سکا اور دم گھٹ کر رہ گیا۔ادب میں اظہارِ رائے کی آزادی کو ادیب کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔تبھی ادب اصلی روح کے ساتھ نشو ونما پا سکے گا۔اس سلسلے میں ممتاز شیریں کی تحریر بعنوان "سیاست ادیب اور ذہنی آزادی" ان کے اسی نظریۂ فکر کو اجاگر کرتی ہے۔نیز ان کے بے لاگ اور بے باک اظہارِ بیان کا بھی بیّن ثبوت ہے۔

وہ لکھتی ہیں کہ جس چیز کے بنانے میں انسانی شعور کو دخل ہو وہ چیز صرف اپنی خاطر باقی نہیں رہتی۔اس کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور نکل آتا ہے۔اس لیے ادب برائے ادب کا فقرہ بہت ہی گمراہ کن ہے۔ادب زندگی کے لیے ہوتا ہے۔اور اپنے سماجی پہلو کے بغیر زندگی کا تصور نامکمل ہے۔

سماج افراد کا مجموعہ ہے۔جب کبھی سماج کی بہتری کا خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے، لامحالہ فرد کی بہتری کا خیال بھی ساتھ ہی ابھرتا ہے۔یہ ہو نہیں سکتا کہ افراد کی حالت گری ہوئی رہے، اور سماج بہتر کہلائے۔سماج کو بہتر بنانے کی جد و جہد فرد کی آزاد نشو ونما اور ترقی ہی کے لیے ہوتی ہے۔اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ فرد کی آزادی ایک انصاف پرور معاشرہ کی تشکیل کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتی۔بلکہ وجود ہی میں نہیں آسکتی۔آج پاکستان میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہوگا، جو اپنے معاشرے کی بہتری کا خواہاں نہ ہو، اور اس مقصد کے لیے اپنے اپنے طریقے سے عمل پیرا نہ ہو۔لیکن یہ یاد رہے کہ ادیب کا کام دھڑے بندی، اور افترا پردازی نہیں، سستے نعرے لگانا اور گالی گلوچ پہ اتر آنا نہیں۔ادیب کا کام لکھنا ہے، یہی اس کی سب سے بڑی ریاضت ہے، لیکن ذہنی آزادی کے بغیر یہ کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔

ممتاز شیریں ذہنی آزادی پر قدغن لگانے کا الزام جہاں ایک طرف سیاسی حکمراں کو دیتی ہیں، وہیں خاص تحریک اور گروہ کو بھی برابر کی ذمہ دار مانتی ہیں۔پہلے زمرے میں راست اشارہ

پاکستان کے تین چار افراد کی طرف ہے۔دوسرا نشانہ تحریک ہے۔اس کی بابت لکھتی ہیں کہ اس گروہ کے افراد دہائی تو عقلیت اور سائنسی تجزیہ کی دیتے ہیں،لیکن اپنا ڈوگما منوانے پر اس قدر مصر ہیں کہ اس سے ہٹ کر کسی کو سوچنے یا کہنے نہیں دیتے۔یہ لوگ انسانی فکر پر پہرہ بٹھا کر انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنا چاہتے ہیں۔بحث وتمحیص کے یہ قائل نہیں،دلیلیں ان کے کام کی نہیں،دشنام طرازی ان کا شیوہ ہے.........وغیرہ۔

آگے چل کر لکھتی ہیں:

مصیبت تو یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے احتساب کے حق میں اور ذہنی آزادی کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں،ان میں سرے سے یہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ ادب کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے۔وہ ادیب کو ایک طرف یا تو صرف تفریح نگار سمجھتے ہیں،یا دوسری طرف محض پرچارک،جو کسی سیاسی پارٹی کی ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق اپنی تحریریں بدل سکے۔

ممتاز شیریں اپنا نتیجہ فکر ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

"جبر"ادب پیدا نہیں کرسکتا۔جب تک ادیب بے ساختگی سے،آزادی سے نہیں لکھتا،ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ادبی تخلیق کو ذہنی ایمانداری سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔"تخلیق"قید میں بارآور نہیں ہوسکتی۔جب ذہنی آزادی فنا ہوجاتی ہے،ادب مرجاتا ہے۔"

ادب کا سیاست سے وابستہ رہنا ضروری ہے۔چونکہ سیاست زندگی کا ایک جز ہے،لہٰذا سیاست کا جز وزندگی ہونے کے ناطے ادب میں گذر ضروری ہے،لیکن اس کا عمل دخل اس حد تک نہ ہو کہ اس پر سیاسی قوانین نافذ کر کے تخلیق کا گلا ہی گھونٹ دیا جائے۔مقصد یہ ہے کہ ادب کسی سیاسی پارٹی کا آلۂ کار نہ بننے پائے۔ورنہ وہ اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ ادب کا سیاست سے سرے سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔اس بات کی وضاحت درج ذیل اقتباس میں کرتی ہیں:

"آج ادب گوشہ فراغت میں پناہ نہیں لے سکتا،اہم معاشرتی اور سیاسی مسئلوں سے گریز ناممکن ہے۔ایک ادیب کے لیے سماجی اور سیاسی شعور لازمی ہے۔موجودہ دور میں ایک بڑا اہم مسئلہ ادیب کے سامنے یہ ہے کہ اس کا اپنے

معاشرہ سے کیا رشتہ ہے؟ خصوصیت سے ان تحریکات سے اس کا کیا رشتہ ہے، جو موجودہ نظام کو بدلنا چاہتی ہیں۔ ادیب کا سماجی اور سیاسی شعور اس وقت بیدار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک ادیب، ایک دانشور کی حیثیت سے اپنے آپ کو سیاست میں اس طرح ضم نہیں کرسکتا جیسا کہ خالص سیاسی پارٹیوں کے ممبر کر سکتے ہیں۔ فنکار کی آزادی اظہار کی خواہش، اور سیاسی پارٹیوں کا محکوم بنا دینے والا جبری احتساب۔۔۔۔۔ ٹریجڈی اسی تضاد کی ہے۔"

ممتاز شیریں نے اپنے نظریہ کی حمایت میں عالمی ادب کے منظرنامے سے مثالیں پیش کی ہیں کہ جہاں ڈکٹیٹر اور حکومتیں فنکار اور ادیب کو ایک سیاسی سنسرشپ کے ماتحت رکھا تو وہاں ادب کا انجام کیا ہوا۔

نپولین کی مثال میں کہا ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت میں فرانس میں سرکاری ادب نافذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی اپنی مرضی کے مطابق ادب کی راہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ ادب اور فنکار کو احکام کے مطابق کام کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک ہی سال بعد نپولین کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے سرکاری ادب کی حکمتِ عملی نے ادب اور فن کے معیار کو نیچے گرادیا ہے۔

اسی طرح ہٹلر نے ادب اور فن کے لیے ایک قومی معیار بنایا تھا۔ اور اس میں اپنے ڈوگما کی تبلیغ کی تھی۔ نیز سارے ملک میں ادیبوں اور فنکاروں پر نظر رکھنے کے لیے ایک نگراں جماعت تشکیل دی۔ فنکاروں کو دیے گئے احکام و اصول کے مطابق کام کرنا ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی نگرانی کے لیے گسٹاپو تک کا استعمال کیا جاتا تھا۔ غرض اس کی یہ تدبیر بھی کام نہ آئی اور انجام بد سے بدتر نکلا۔

اطالوی یعنی فسطائی فن کی حالت بھی دگرگوں رہی۔ وہاں توٹیلیٹیرین ریاستوں میں سارے عناصر کو ایک مرکزی تسلط کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا۔ حتیٰ کہ جمالیاتی قدریں، فن اور ادب تک کو مفر حاصل نہ تھا۔ یہی حال روس میں ہوا کہ فنکاروں اور ادیبوں پر جو عائد حد بندیاں اور پابندیاں ہیں، اس کی زندہ اور مستند مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

1943 کے افسانے ....ایک جائزہ:

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اس میں ممتاز شیریں نے 1943 میں جو افسانے منظر عام

پر آئے ،ان کا مختلف پہلو سے تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔دوسال قبل کی تخلیقات سے بھی اس کا موازنہ کیا ہے۔راقم کو یہ مضمون بنگلور میں بسونگڈی سے اشاعت کے دوران رسالہ'نیادور' شمارہ اگست رستمبر 1944 میں پڑھنے کو ملا ہے۔

اصناف ادب میں افسانہ جس کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی سے ہوا،اس پر ابھی نصف صدی سے بھی کم عرصہ گذراتھا،اس کے باوجود قابلِ لحاظ افسانوی ادب وجود میں آچکے تھے۔لیکن

ممتاز شیریں کے اس جائزہ کے دائرہ میں صرف 1943 کا افسانوی ادب آتا ہے،اس سے دوسال قبل کے افسانوی تخلیقات سے بھی موازنہ ملتا ہے۔جن صف اوّل کے لکھنے والوں کی تخلیقات جائزہ میں آئی ہیں،ان میں سعادت حسن منٹو،عصمت چغتائی،اشک عسکری،اختر اورینوی،فیاض محمود،دھرم پرکاش آنند،رشید جہاں،احمد علی،اختر انصاری،اختر حسین رائے پوری،حیات اللہ انصاری اور عاشق حسین بٹالوی کے نام آتے ہیں۔ان میں سے نصف اوّل کے متعلق ممتاز شیریں نے رائے قائم کی ہے کہ اس سال بھر میں ان حضرات نے صرف ایک یادوافسانوں کی تخلیق پر ہی اکتفا کیا،اور نصف ثانی نے تو کچھ لکھا ہی نہیں۔

ادبا کی اس خاموشی کا سبب وہ 'ساقی' اور 'نیاادب' رسالوں کا بند ہونا خیال کرتی ہیں۔چونکہ مذکورہ ادبا میں بعض ان رسالوں کے مستقل قلم کار تھے۔جنھوں نے کچھ لکھا وہ اس معیار کی تخلیق نہیں پیش کر سکے،جن کا تقابل خود ان کے پہلے کی تخلیق سے کیا جاسکے اور معیاری کی سند دی جاسکے۔جملہ طور پر جائزہ میں وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ 1943 کا افسانوی ادب شاندار ادب نہیں رہا۔البتہ موضوعات کے لحاظ سے تنوع کا اعتراف کیا ہے۔چونکہ ان میں جنسیات،محبت،نفسیاتی تجزیہ نگاری،بیکاری،بھوک،سرمایہ داری کا ظلم،استبداد جیسے موضوعات پر ادبا نے خامہ فرسائی کی تھی۔

جائزہ میں جنگ کے موضوعات پر افسانوں کا فقدان نظر آیا۔اس کمی کو ممتاز شیریں نے شدت سے محسوس کیا۔ان کی نظر میں اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہو کہ سرزمین ہند ابھی جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں نہیں آئی ہے۔اسی لیے ہندستانی ادیب جنگ کو اس شدت سے محسوس نہیں کر پائے۔

ممتاز شیریں کا وسعتِ مطالعہ اور عالمی ادب پر ان کی گہری نظر اس بات کو بھی محسوس کیے بغیر نہ رہی کہ یہ بات صرف ہندوستان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔بلکہ انگلستان،امریکہ اور

یورپ کے بیشتر ممالک میں بھی جنگی ادب ناپید ہے۔اس کے برخلاف چین اور روس میں بہترین جنگی ادب پایا جاتا ہے اور اچھے شہ پارے بھی دیے ہیں۔

شیریں کی ادبی حس نے وہاں کے اس نقص کو بھی جلد ہی بھانپ لیا کہ ایسے افسانے بھی بہتات سے لکھے جا رہے ہیں، جو فن کے اعلیٰ معیار پر نہیں اترتے۔اور وہ صرف پروپگنڈا کا پٹارا ہیں۔البتہ جو مختصر جنگی کہانیاں چھوٹی کتابوں کی شکل میں شائع ہو رہی ہیں، اچھا ادب فراہم کیا ہے۔روس میں جن افسانہ نگاروں نے کمال حاصل کیا اور اپنی تخلیق کے بل پر بین الاقوامی شہرت حاصل کی، ان میں مائیکل شالوخوف، الیا ہربرگ، اکزی ٹالسٹائی، سیموناف اور زوشچوف وغیرہ کے نام سرِفہرست آتے ہیں۔

وہ لکھتی ہیں کہ ہندوستان پر جنگ کا اثر صرف اشیا کی گرانی کی صورت میں ہوا ہے۔بنگال کا قحط اس کی مثال ہے۔اس زاویہ سے چوٹی کے لکھنے والوں میں سے اکثر نے جنگ کے اثر کو قبول کیا ہے، خاص طور سے سب سے زیادہ یہ تاثر کرشن چندر کے یہاں افسانہ 'بالکونی' میں ملتا ہے۔

جدید ترین موضوع پر لکھنے کا سہرا ممتاز شیریں نے جائزہ کے سال میں خواجہ احمد عباس کے سر رکھا ہے۔ان کا افسانہ 'ایک پائلی چاول' راشننگ سسٹم کی عکاسی کرتا ہے۔اس کے علاوہ موجودہ جنگ کے تناظر میں انھوں نے ایک افسانہ "Tomorrow is our" "انگریزی میں بھی لکھا ہے، مگر شیریں نے اسے غیر معیاری بتایا ہے۔

غرض شیریں نے اپنے جائزہ میں سال 1943 میں سال بھر کے افسانوں میں چھ افسانوں کو بہترین افسانے قرار دیا ہے۔ان میں بھی کرشن چندر کے افسانہ 'بالکونی' کو اس سال کا شاہکار ادب کہا ہے۔دیگر منتخب افسانے درج ذیل ہیں:

ٹریفس) بیدی (ننھی سی جان) عصمت چغتائی (مورا) ممتاز مفتی (ایک پائلی چاول) خواجہ احمد عباس کے ہیں۔ممتاز شیریں نے اس کے علاوہ دس مزید افسانوں کا نام لیا ہے، جو نسبتاً معیار کے اس درجے پر نہیں ہیں۔

ممتاز شیریں نے اس جائزہ میں جس محنت و لگن اور ادبی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ان کی ادبی، فنی اور تنقیدی حیثیت کو اجاگر کرتا ہے۔دلچسپ بات یہ کہ انھوں نے ہر ایک منتخب افسانے کا

فنی اور تکنیکی جائزہ علاحدہ طور پر پیش کیا ہے، اور ہر ایک کے حسن و قبح کو اجاگر کر کے اس پر نہ صرف اپنی رائے قائم کی ہے بلکہ شہ پاروں میں اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا ہے۔

رہی بات 'نیادور' کی اشاعت و ادارت میں ممتاز شیریں کی حصہ داری اور فعال کردار کی تو یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان کی شراکت داری کو کسی ایک زاویہ تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کے افسانہ ''اپنی نگریا' کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ نیادور صمد شاہین اور ممتاز شیریں کا مشترکہ مشن تھا، جس میں دونوں یکساں طور پر منہمک اور مصروف کار رہے۔ نیادور دونوں ہی کی ادبی زندگی کا جز ولاینفک تھا۔ دونوں کے درمیان کام کی تقسیم بھی ممکن نہیں۔ جن سے جس وقت جو بن پڑا، پوری لگن اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ چھوٹے سے بڑے کام تک خود ہی کرتے تھے۔ قابل ذکر بات یہاں یہ ہے کہ اس کام کی انجام دہی میں دونوں ہی ایک دوسرے کے معاون و مدد ثابت ہوتے اور صمد شاہین نے تو ممتاز شیریں کی محض موجودگی کو بھی ان کی احسان مندی سے تعبیر کیا ہے۔

لہٰذا ممتاز شیریں نے نہ صرف ایک نیک اور صالح بیوی ہونے کے ناطے اس کام کے دوران ان کے جسمانی راحت و آرام، تفریح طبع اور ذہنی آسودگی کا خیال رکھا بلکہ دیگر زبانوں سے افسانوں کے ترجمے، مضامین و نظموں کا انتخاب، پھر اس کی ترتیب، قارئین کے خطوط کا جواب حتیٰ کہ ٹائٹل پیج کیسا ہو، اس کا رنگ، فونٹ سائز اور خط تک کے انتخاب میں ممتاز شیریں کی رائے مشورے کو عمل دخل تھا۔ اس طرح نیادور میں ان کا کردار ہمہ جہت اور نہایت ذمہ دارانہ رہا ہے۔
درج ذیل اقتباسات ان کے افسانہ اپنی نگریا سے ماخوذ ہیں، جو نیادور کے تعلق سے ان کے مختلف کردار اور حیثیت کو نمایاں کرتی ہیں۔

صمد شاہین ممتاز شیریں کی کچھ دنوں کی غیر موجودگی کو کس شدت سے محسوس کرتے ہیں، اور اس کا کیا اثر ان پر مرتب ہوا ہے، زیر نظر اقتباس میں ملاحظہ کیجیے۔

''سچ تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو مجھے کتنی دشواری ہوتی، پھر وہ پیاری ڈوبی آواز میں کہنے لگے'' تم صحیح معنوں میں جیون ساتھی ہو، میری نازی، میری ہم ذوق، میرے ارادوں میں، میرے کام میں ساتھ دینے والی!'' تم جانتی ہو، ان دنوں کتنا کام ہوتا ہے۔ ڈھیروں کام سامنے پڑا ہے

اورتم یہاں نہیں ہو، یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے بھی کام لینا چاہتا تھا۔لیکن میری نازی، میری اپنی نازی، تم یوں ہی میرے سامنے بیٹھی رہو، تو میں دُگنا تگنا کام کرسکتا ہوں۔صرف تمھاری موجودگی مجھ کو گویا ایک بجلی سی پھرتی دیتی ہے۔ میں خوشی میں سرشار رہتا ہوں اور کام ہلکا معلوم ہوتا ہے۔لیکن اب میرا من اداس ہے۔دل پر ایک بوجھ سا رہتا ہے۔کام بہت بھاری معلوم ہوتا ہے......۔

یہاں شیریں نے قارئین کے اس وہم کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ موہنی صورت لیے محض اپنے شوہر کی نورِ نظر اور مضطرب دل کا قرار بن کر ہاتھوں پر ہاتھ دیے یوں ہی بیٹھی نہیں رہتی تھی، بلکہ شوہر کے ساتھ کاموں میں برابر شریک رہتی تھیں۔

''لیکن وہ یوں ہی نہیں بیٹھی رہتی تھی۔وہ بھی ان کے ساتھ کام کیا کرتی۔وہ دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے۔کبھی خطوط لکھ رہے ہوتے، مضامین پڑھ کر انتخاب کر رہے ہوتے۔ٹائٹل پیج کے لیے ڈیزائن تجویز کر رہے ہوتے۔رنگوں کی آمیزش پر بحث کر رہے ہوتے۔پروف دیکھ رہے ہوتے۔اعزازی پرچے بھیج رہے ہوتے۔خریداروں اور ایجنسیوں کو پرچے پیک کروا کے بھجواتے۔آمد وخرچ کا اندراج اور حساب اور پھر خطوط۔روز بیسیوں خطوط! وہ چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی دلچسپی سے آپ ہی کیا کرتی۔رسیدوں کی پرانی کتاب بھر گئی تھی۔وہ چپکے سے اٹڈین لسز کی کاپیاں اٹھا لائی، اندر کے پونے پونے صفحے کاٹ ڈالے اور تین کاپیوں میں منی آرڈر، وی پی، اور رجسٹریوں کی رسیدیں چپکا دی تھی۔شاہد چپکے سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔یوں ہی مسکراتی رہی۔ارے یہ سب تم کیوں کرتی ہو۔جانی تھک جاؤ گی۔دوسرے کام ہی کیا کم ہیں تمھارے لیے''

ممتاز شیریں نے جب نیا دور کے مشمولات کو ترتیب دیا اس پر صمد شاہین کا تبصرہ پھر زریں مشورہ،......شوہر کے حسنِ ترتیب پر ممتاز شیریں کا برملا اعتراف.

> ''انھوں نے میری بات کاٹ دی۔اوہ! نازی! تو سب بڑے بڑے ناموں کو شروع میں رکھنا چاہتی ہو، ترتیب میں ناموں کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔مشہور لکھنے والوں کے مضامین تو سب پڑھتے ہی ہیں، خواہ وہ شروع

میں چھپے ہوں یا درمیان میں یا آخر میں۔ ترتیب میں محض ناموں کا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔" ٹھہرو میں پہلے ایک رف سا خاکہ بنالیتا ہوں۔ پھر ترمیم کرنا ہو تو غور کریں گے۔ شاہد محض یوں ہی ترتیب نہیں دیتا تھا۔ کتنا سلیقہ ہوتا تھا اس کی ترتیب میں! مشہور اہل قلم بھی اس کے سلیقہ اور اس حسن ترتیب کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ کیا کہوں آپ کو پرچہ مرتب کرنے کا ایسا سلیقہ ہے۔ 'دور جدید' کے مضامین تو بلند پایہ ہوتے ہی ہیں، لیکن اس میں انداز ترتیب سے نئی جان، نئی بیداری، نیا حسن پیدا کر دیتے ہیں۔"

بہر کیف ممتاز شیریں ان خوش نصیب ادیبہ میں سے ہیں، جنھیں اردو کاز کے لیے بیرون ممالک کے سیاحت کا موقع ملا۔ وہ 1963 سے 1967 تک ترکی میں رہ کر ایشیا اور یورپی ممالک کی سیر کی۔ 1970 کے درمیان انھیں کینسر کا موذی مرض لاحق ہوا لیکن اس کا انکشاف موت سے صرف تین دن قبل ہوا، 1973 میں پولی کلینک اسلام آباد میں زیر علاج رہیں۔ 11 ر مارچ 1973 کو وہ اس دارفانی سے رخت سفر باندھ چلیں۔

ماخذات

☆ یادرفتگاں: ممتاز شیریں — از یوسف عارفی (مرحوم)
☆ نیادور (آزادی نمبر) — مطبوعہ 1949
☆ نیادور — شمارہ اگست رستمبر 1944
☆ ادب شناسی — پی یوسی (اول) اردو نصابی کتاب

سلیمان خطیب

کرناٹک میں طنز ومزاح اور ظرافت سے بھر پور شاعری کے حوالے سے سلیمان خطیب محتاج تعارف نہیں۔ خاص طور سے دکنی زبان کو وسیلۂ اظہار خیال بنا کر اس زبان کو ایک نئی زندگی بخشنے اور اس کے فروغ کی راہیں ہموار کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ شعرا کی صف میں ان کی انفرادی پہچان تھی۔ دکنی زبان کے لباس میں آراستہ، طنز وظرافت سے بھر پور کلام، پیشکش کا اچھوتا انداز سامعین پر جادو کا اثر کرتا تھا اور وہ مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ کرناٹک کے شمالی خطہ بیدر کو اس بات پر ہمیشہ ناز رہے گا کہ اس مردم خیز علاقہ سے سلیمان خطیب جیسی باغ و بہار شخصیت کی مالک، طنز ومزاح اور ظرافت کے بے تاج بادشاہ افق ادب پر نمودار ہوئے۔ جنھوں نے جہاں ظرافت کو فروغ دیا وہیں موروثی دکنی زبان کا اقبال بلند کیا۔

سلیمان خطیب ضلع بیدر کے مقام چٹگوپہ تعلقہ ہمنا آباد میں پیدا ہوئے۔ نام سلیمان اور خطیب خاندانی ٹائٹل تھا، جب میدان شعر وسخن میں قدم رکھا تو یہی تخلص کیا۔ والد کا نام محمد صادق خطیب تھا۔

بہت سے پیش رو شعرا وادبا کی طرح سلیمان خطیب کو بھی زندگی کے آغاز ہی میں صبر آزما ایام غم سے گذرنا پڑا۔ چھ سال کی کمسنی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور کوئی دس ماہ بعد والدہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ جس سے وہ ماں کی ممتا بھری نگاہ شفقت سے بھی محروم ہو کر یتیم ہو گئے۔ غم زندگی کے اس متواتر جھٹکے نے تعلیم سے ایسا بے توجہ کر دیا کہ دس برس کی عمر تک اسکول کا

منہ تک نہیں دیکھا۔ بعد میں بڑے بھائی محمد وزیرالدین کی توجہ خاص سے رائچور آئے جہاں اسکول کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول کی تعلیم میٹرک میں محمد حسین ادیب اور مولانا عبدالرحیم صدیقی حیرت جیسے ماہر اساتذہ کی زیر تربیت رہ کر حاصل کی۔ آگے کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے منشی فاضل کا امتحان دیا۔

ملازمت پیشہ کیریئر کا آغاز 1941 میں میکانیکل فورمین محکمۂ واٹر ورکس گلبرگہ سے کیا۔اور دسمبر 1977 تک فلٹر بیڈس کی خدمات پر مامور رہے۔ یہاں واقع ان کی رہائش گاہ 'پانی محل' کے نام سے مشہور تھا۔ سلیمان خطیب 1946 میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ دس اولاد ہوئیں، پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔

سلیمان خطیب کو بچپن سے ہی شعر وسخن سے ایسی دلچسپی رہی، جیسے یہ ان کی خمیر کا حصہ ہو۔ شعور واحساس کی نشوونما کے ساتھ فکرِ سخن کا ذوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آیا کہ طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی اور میدان شعر وشاعری میں باضابطہ قدم رکھ دیا۔ پیکرِ فکر وفن کو جنوب کی قدیم دکنی زبان کا پیرہن عطا کیا۔

سلیمان خطیب اپنے خاص چہرے مہرے، وضع قطع، زیب تن لباس اور نازک اندام ومستانہ چال، سامعین سے لطف اندوزی پھر شعر گوئی کا خاص انداز، ان سب باتوں کو لے کر وہ اپنے اندر ایک عجیب کشش رکھتے تھے۔ بچے سے بوڑھے تک آپ کے دیدار کی ایک جھلک ہی سہی، پانے کے لیے بے قرار رہتے۔ پھر آپ کے پر مزاح اشعار کی سماعت کے لیے کان بے تاب۔ حد تو یہ ہے کہ ان پر ہی حاضرین کے ذوق سماعت کو تسکین ملتی اور وہی محفل مشاعرہ کا ماحصل ہوتے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا اخیر میں ان کی آمد گویا مشاعرہ کے اختتام کا اعلان بھی ہوتا۔

سلیمان خطیب کے نہایت قریبی دوست ڈاکٹر وہاب عندلیب، ادیب و مصنف (سابق چیرمین کرناٹک اردو اکیڈی) نے بڑے دلچسپ انداز میں سلیمان خطیب کا نہ صرف قلمی خاکہ کھینچا ہے بلکہ مشاعروں میں وہ کس طرح اپنا سکہ جماتے تھے، بے لاگ طور پر بیان کیا ہے:

"گندی رنگ، دُہرا جسم، داڑھی مُنڈھی ہوئی، مونچھ ہٹلری، لیڈی کٹ عینک

کے شیشوں سے جھانکتی بڑی بڑی آنکھیں، سر کے بال تفکرات کی نذر، رہے سہے بال ٹوپی کے کناروں پر جھالر کی شکل میں آویزاں، کبھی جناح کیپ تو کبھی آزاد کیپ، کبھی فلیٹ ہیٹ تو کبھی سمور کی ٹوپی زیب سر کیے کشمیر سے واپسی کا اعلان کرتے نظر آئیں گے۔ شکم تیزی سے قبہ بننے کی طرف مائل، قد میانہ، چال مستانہ، وضع دلبرانہ، شاعری تن تن تانا تانا۔ لیجیے یہ ہیں خطیب محمد سلیمان المعروف بہ سلیمان خطیب جو پہلی نظر میں فسانۂ آزاد کا کردار یا شنکر ویکلی کا کارٹون معلوم ہوتے ہیں۔''

یہ ان کی ظاہری ہیئت کی لفظی تصویر تھی، جسے وہاب عندلیب صاحب نے موئے قلم سے کھینچی ہے۔ لیکن جب یہ سراپا تصویر اسٹیج پر براجمان ہوتی ہے اور زبان حرکت میں آتی ہے تو مشاعرہ کا منظر نامہ کس طرح بدلتا ہے اور وہ سامعین سے کیسے مخاطب ہوتے ہیں، وہ بھی وہاب صاحب کے الفاظ ہی میں ملاحظہ کیجیے:

''بظاہر ان کا یہ حلیہ بڑا بے ترتیب سا لگتا ہے۔ مگر جب وہ شعر سنانے لگتے ہیں، تو مجسم حُسن دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام سننے کے لیے آدمیوں کا سیلِ رواں ٹھہر جاتا ہے۔ اور مدح و ثنا کے ڈونگے بجتے ہیں۔ مشاعرے میں جب تمام شعرا اپنا کلام سنا لیتے ہیں تب خطیب صاحب کی باری آتی ہے۔

وہ پہلے حاضرین کو ڈانٹ پلاتے ہیں، اپنی فقرہ بازی اور برجستہ گوئی سے ان پر رُعب جماتے ہیں۔ پھر شاعری کی شامت آجاتی ہے۔ کچھ نظم، کچھ نثر، کبھی نظم مختصر تو اس کی تمہید طولانی اور کبھی تمہید مختصر تو نظم طول طویل۔ ایک نظم سُنانے کے بعد مائک سے اپنی نشست کی سمت بادلِ ناخواستہ واپسی کا قصد فرمانا چاہتے ہیں کہ سامعین تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں فرمائش کی بوچھار کردیتے ہیں۔ شاعر کے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اپنے ہیرو کی واپسی پر عوام کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ پہلی تاریخ، ساس بہو، چھورا چھوری، پہلی

جھگی، چچے پاؤ حکیم، ہراج کا پلنگ، فرطِ مسرت میں وہ ساری نظموں کے عنوان گنا دیتے ہیں۔ اور پھر شاعر بیچارہ کبھی نازاں، کبھی خنداں، کبھی شاداں، کبھی حیراں، فرمائشوں کی تکمیل کے لا متناہی سلسلے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ عوام تحسین و آفریں کے غلغلے سے مشاعرہ گاہ کو سر پر اٹھا لیتے ہیں، اور ایک عجیب سا سماں بندھ جاتا ہے۔ اس طرح کشمیر سے کنیا کماری تک بارہا مشاعرے پڑھتے ہی نہیں، بلکہ لوٹتے رہتے ہیں۔"

وہاب عندلیب صاحب نے مشاعرہ میں ان کی شرکت کا جو نقشہ کھینچا ہے، تقریباً اسی انداز میں انھوں نے کم و بیش ربع صدی تک ہندستان بھر میں مشاعرے میں بے تاج بادشاہ بن کر راج کرتے رہے۔ بلکہ ان کے تعلق سے ایک قول یہاں تک نقل کیا جاتا ہے کہ "ہندوستان کا کوئی مشاعرہ ان کی شرکت کے بعد کامیابی سے بچ نہیں سکتا"

کلام سنانے کے ان کے منفرد لب و لہجے اور انوکھے انداز کا تذکرہ بہت سے اہل قلم احباب نے اپنی تحریروں میں الگ الگ انداز میں کیا ہے۔ جس سے بجائے تکرار کے ان کی شخصیت کے نئے رنگ و روپ اور طنز و ظرافت کا ایک نیا امتزاج ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اور طبیعت ان تذکروں کو پڑھ کر باغ باغ ہو جاتی ہے۔

مختار احمد منو نے سلیمان خطیب کا مشاعرہ میں شرکت کا نقشہ وہاب عندلیب صاحب سے ایک قدم آگے بڑھ کر یوں کھینچا ہے:

"خطیب صاحب مشاعرہ میں شرکت کے لیے بڑا اہتمام کیا کرتے تھے۔ شیروانی، چوڑی دار پائجامہ، اونچی دیوار کی سیاہ ٹوپی، سلیم شاہی جوتے پہنا کرتے۔ یوں محسوس ہوتا کہ خطیب صاحب مشاعرہ پڑھنے نہیں، بلکہ اپنا نکاح پڑھوانے جا رہے ہیں۔ ناظمِ مشاعرہ کی دعوتِ کلام پر خطیب صاحب مشاعرہ پڑھنے کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنی نشست سے اٹھتے، بڑے ہی ناز و انداز کے ساتھ متوالی چال کے ساتھ مائک کی طرف بڑھتے۔ ان کے اپنی جگہ سے اٹھنے اور مائک تک آنے کے انداز پر

ہی سامعین کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے۔سامعین میں سے کوئی منچلا آواز
لگاتا" کیا پاؤں میں مہندی لگی ہے ماموں"۔خطیب صاحب مُسکراکر
کہتے" بھانجے مہندی کے دن ہوا ہو گئے،اب تو بھلاویں کے دن ہیں"۔خطیب
صاحب مائک کے پاس آتے۔خاموش کھڑے ہوتے۔سامعین پر نظریں
دوڑاتے۔کبھی اپنی شیروانی کے بٹن سے کھیلتے تو کبھی اپنے کان کے بالوں سے
کھیلتے۔ان کی یہ خاموشی یہ انداز سامعین کے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔تب ہی
سامعین میں سے آواز آتی" کیا ہوا چچا کچھ تو بولو" خطیب صاحب
مسکراکر کہتے" جاگ گیا بھتیجے،اب تک لوری سن رہا تھا،اب شاعری سن"۔

سلیمان خطیب کا سامعین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ،ان پر فقرے چُست کرنا،پھبتیاں کسنا ان کا عام معمول تھا۔اسی سے سامعین اُبھارتے،پھر وہ ہوتے اور سامعین کا شوروغوغا۔ان پر قابو پانے کا ہنر بھی خوب جانتے تھے۔حاضر جوابی سے مخاطب کو لاجواب کر دیتے۔لیکن دل کے بڑے صاف اور وسیع ظرف رکھتے تھے۔مختار احمد منو اس تعلق سے مزید لکھتے ہیں کہ:

"خطیب صاحب بڑے ہی حاضر جواب تھے۔ان کی حاضر جوابی سب کو
لاجواب کر دیتی۔خطیب صاحب بڑے زندہ دل انسان تھے۔وہ کبھی بھی
ہوٹنگ کا چُست فقروں،نوک جھونک یا پھر مکالمہ بازی کا بُرا نہیں مانتے
تھے۔اپنی حاضر جوابی سے،اپنے انداز اور برجستگی سے،اپنی دلچسپ باتوں
سے خود ہی شوروغل کا ماحول بنا دیتے۔سامعین کو جہاں خطیب صاحب کے
مائک تک آنے کا انداز بے حد پسند تھا،وہیں خطیب صاحب کے کلام سنا کر
واپس جانے اور بے حد اصرار پر پھر سے مڑ کر واپس آنے کا انداز بھی بے حد
پسند تھا۔"

سلیمان خطیب صاحب نے اپنے منفرد لہجے کی شاعری کی دھاک جنوب سے شمال تک مچائی اور ہر جگہ اپنی انفرادیت اور دکنی لب ولہجہ کا جھنڈا گاڑ کر آئے۔مشاعرے میں شرکت کے

لیے ممبئی، دہلی، پٹنہ سمیت ملک کے دور دراز علاقوں تک کا سفر کیا تھا۔ حتیٰ کہ کشمیر کی باغ و بہار وادی اور پُر کیف مناظر میں بھی اس بلبلِ دکن کی گونج سنی گئی اور وہاں بھی اپنا پرچم لہرا کر آئے۔

مجتبیٰ حسین (گلبرگہ)، جو نثر میں مزاح نگاری کے لیے معروف ہیں، بلکہ سلیمان خطیب کا ہم رتبہ اور ہم مشغلہ کہنا چاہیے، نے دہلی کے ایک مشاعرے میں سلیمان خطیب صاحب کی شرکت اور کامیاب اداکاری کے واقعہ کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب سلیمان خطیب مشاعرہ لوٹ لیتے تو اس طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتے گویا کوئی علاقہ فتح کر لیا ہو، جیسا کہ ذیل کے واقعہ میں محسوس کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''1772 سے جب میں دہلی میں رہنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ سلیمان خطیب کو دہلی سے اور دہلی کو سلیمان خطیب سے روشناس کرانا چاہیے۔ چنانچہ دہلی پہنچنے کے تین مہینہ بعد ہی میں نے مسز سبھدرا جوشی کے رسالے 'سیکولر ڈیموکریسی' کے کارکنوں کو ورغلایا کہ وہ ہولی کے موقع پر ایک کل ہند مزاحیہ مشاعرہ منعقد کریں۔ میری بات مان لی گئی اور حیدرآباد سے کئی زندہ دل اور گلبرگہ سے سلیمان خطیب دہلی پہنچے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں سلیمان خطیب کی دکنی شاعری دہلی والوں کے لیے بھاری نہ پڑ جائے۔ اس لیے میں نے مشاعرے میں ماحول کو سازگار بنانے کی خاطر ایک لمبا چوڑا تعارف لکھ دیا۔ لال قلعے کے سامنے یہ مشاعرہ تھا۔ ہزاروں سامعین موجود تھے۔ جن میں مرکزی حکومت کے کئی وزرا شامل تھے۔ دہلی میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ تھا۔ میں دل ہی دل میں سلیمان خطیب کے تعلق سے خوف زدہ تھا۔ لمبے چوڑے تعارف کے بعد جب سلیمان خطیب مائک پر آئے تو میں نے دم سادھ لیا۔ میں یہ کہتا چلوں کہ سلیمان خطیب بہت اچھے اداکار بھی تھے۔ جہاں شاعری سے کام چلنے کا امکان کم ہوتا، وہاں شاعری سے پہلے ڈرامائی ماحول ضرور تیار کرتے۔
>
> سلیمان خطیب نے اس رات ڈرامہ اور شاعری دونوں صلاحیتوں کو کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ سارا پنڈال تالیوں اور قہقہوں سے گونجنے لگا۔ وہ بے پناہ

داد وصول کر کے مائک سے واپس آئے تو حسبِ معمول میرے پاس آئے اور بولے" کیوں پاشا!اب بول کیا بولتا ہے۔لال قلعے پر گلبرگہ کا جھنڈا اگاڑ دیا نا"۔لال قلعہ پر گلبرگہ کا جھنڈا اگاڑنے والی بات انھوں نے یوں کہی جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ ماضی میں ہمیشہ شمال والوں نے دکن پر حملہ کیا تھا،اب کئی صدیاں گذرنے کے بعد لال قلعہ پر دکن کا کامیاب حملہ ہوا ہے۔اس جملے کے ساتھ ہی مجھے ابوالحسن تاناشاہ عبدالرزاق لاری،حسن گنگو بہمنی اور نہ جانے کن کن کی یاد آ گئی۔"

خطیب صاحب مرحوم کی زندگی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشاعرہ کے لیے انھوں نے خود کو وقف کر رکھا تھا۔مشاعرہ میں شرکت کی دعوت پر ہر صورت میں شریک ہونے کی کوشش کرتے اور اگر راہ میں ملازمت پیشہ آڑے آتا اور رخصت کا ملنا دشوار ہوتا تو کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے ترکیب نکال لیتے،اس کی مثال میں درج ذیل واقعہ جسے مجتبیٰ حسین نے حمایت اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

"زندہ دلان کے ایک مشاعرے میں وہ شرکت سے محض اس لیے معذور تھے کہ ان کا عہدے دار اعلیٰ انھیں حیدر آباد جانے کے لیے رخصت منظور کرنے کو تیار نہیں تھا۔اس کے باوجود انھوں نے مشاعرے میں شرکت کی ایک ترکیب نکالی۔حمایت اللہ کو مشورہ دیا کہ وہ حیدر آباد سے کچھ ایسا ٹیلی گرام روانہ کریں کہ ان کا عہدے دار انھیں چھٹی دینے پر مجبور ہو جائے۔حمایت اللہ نے اپنے فد کے اعتبار سے سوچا کہ خطیب بھائی کی ساس صاحبہ غالباً دنیا سے گذر چکی ہیں۔لہٰذا ان کی علالت کا تار کیوں نہ دیا جائے۔سو سلیمان کو تار بھی گیا۔اور وہ آ بھی گئے۔اس ٹیلی گرام کے آنے کے بعد سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔سلیمان خطیب کو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی جستجو کرنی پڑی کہ ٹیلی گرام اور ٹیلی گرام کی ساس دونوں مختلف اور فرضی ہیں۔رخصت تو منظور ہوئی مگر حمایت اللہ سے کئی دنوں تک ناراض رہے کہ میری ساس کے جان کے پیچھے

کیوں پڑا ہوا ہے۔ وہ اپنے سسرالی رشتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔"

مرحوم نے نصف صدی سے زائد عرصہ کی زندگی پائی، جس کا بیشتر حصہ شعروسخن، ہنسنے ہنسانے میں گذارا۔ بقول وہاب عندلیب صاحب 1960 کی دہائی سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ جس کے بعد ان کے اقبال کا سورج چڑھتا ہی رہا، کبھی اس کو زوال نہیں آیا۔ اس مدت میں انھوں نے نثری وشعری تخلیقات کا گراں بہا سرمایہ اردو دنیا کو دیا۔ شعری تخلیقات میں ان کی نظموں کو مختلف مرکزی عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً سماجی اصلاح کے تحت پہلی تاریخ، چھورا چھوری، ساس بہو، اٹھائیس تاریخ، ہراج کا پلنگ، بیچارگی، اور مناظر فطرت کے ضمن میں پگڈنڈی، ندی، موت کا پانی، پانی دے رے میگھ راج، بہو کالا، حب الوطنی کے موضوع پر ہمالہ کی چاندی، چینی گڑیا، بہادر بیٹا، ایسا سمئے اب آئے گا وغیرہ نظمیں لکھی ہیں۔ جبکہ سیاست اور سیاست کی گلیاری کو موضوع بناتے ہوئے الیکشن کا موسم، چمچے، کانا دجال، آخری تمنا اور سفیر امن کے عنوان پر نظمیں کہی ہیں۔ انھوں نے رومانیت کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور عشق و محبت کے موضوع پر پڑوسن، دکنی عورت کا انتظار، سن رے گوی، یاد، محبوب صاحب محمود بی کے عنوان سے رومانیت کو پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں جہاں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے، وہیں طنز وظرافت کے ساتھ ساتھ نقد کا نشتر بھی چبھویا ہے۔ جملہ طور پر ان کی نظموں میں ساس بہو، پہلی تاریخ، سانپ، روٹی، رستے، تلاش گمشدہ، اٹھائیس تاریخ، ہراج کا پلنگ اور الیکشن کا موسم، وغیرہ سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ عوام وخواص میں یہ نظمیں بے حد مقبول ہیں۔

خطیب تحسین نے اپنے والد کے طریقۂ شعر نویسی کی بابت لکھا ہے کہ "میں نے کبھی انھیں قلم اور بیاض لے کر شعر لکھتے نہیں دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں شعر کہتے اور دماغ میں محفوظ رکھتے تھے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خیالات کے بہاؤ میں وہ قافیہ، ردیف، اور بحر کی پابندیوں کو حائل نہ ہونے دیتے تھے۔ پہلے خیال کے پرندے کو الفاظ میں باندھ لیتے اور جب نظم مکمل ہو جاتی تو بے وزن اشعار کاغذ پر لکھ کر برابر کر لیتے۔ اس میں ایسا بہت ہی کم ہوتا۔ انہیں سارا کلام زبانی یاد تھا۔ شاید ہی کبھی انھوں نے لکھ کر پڑھا ہو۔

ایک مصلح قوم، ہمدردملت، زمانہ کا نبض شناس، اور اپنی تہذیب وثقافت کا نقیب اور امین بن کر اپنے کلام میں شعبۂ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ معاشرہ کے جس شعبہ میں بھی آپ نے بے راہ روی دیکھی، بیباک انداز میں اسے موضوع سخن بنایا۔ خواہ ارباب حل وعقد ہوں کہ احباب علم و دانش، سماجی زندگی ہو کہ انفرادی، نت نئے سماجی ریت رواج، مردوزن کی نفسیات اور اس کے عادات واطوار کو موضوع بنا کر حالات وواقعات کی خوب عکاسی کی ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری کے موضوعات بالکل جداگانہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے لیے انھیں کوئی اضافی محنت نہیں کرنی پڑی۔ ان کا مشاہدہ بہت وسیع اور قوی تھا۔ لہٰذا جو کچھ ان کی دوررس نگاہ نے دیکھا، اور قوت حس نے محسوس کیا، اس کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے کلام میں نہایت احتیاط اور صاف ستھری ظرافت دیکھنے کو ملتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ صحیح قسم کی ظرافت بہت سی ناگواریوں کا علاج ہے۔ اس سے خوش مزاجی، روزمرہ کی زندگی اور رشتوں میں لطف اور شیرینی پیدا ہوتی ہے۔ وہ ظرافت جس کا مقصد دل دکھانا نہ ہو، جو دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ حماقتوں پر طنز کرے، کسی کی ذاتی تحقیر نہ کرے، وہی اثر پذیر اور قابل قبول ہوتی ہے۔ اور یہی خوبی سلیمان خطیب کے کلام کی ہے۔

نثری تخلیقات:

سلیمان خطیب مرحوم کو جس طرح نظم میں کمال حاصل تھا، اسی طرح وہ نثر میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اگرچہ نظم کی نسبت نثری تحریر کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن دیگر مضمون نویسوں کی زیادہ تحریروں پر بھاری ہے۔ ان کی نمائندہ تحریروں میں مضامین بعنوان الیکشن کا موسم، کتاب پڑھنے کی تکنیک، آنکھیں، ماضی پر ایک نظر، خیریت اور گلبرگہ کلب کا ایک شاعر، میری زندگانی اور دروغ بیانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مضامین مختلف جرائد ورسائل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دکنی نثری ادب کی نمائندہ تحریریں ہیں۔ جن میں سماجی اور معاشرتی مسائل کی بھرپور ترجمانی اور عکاسی ملتی ہے۔

مضمون 'الیکشن کا موسم' میں الیکشن کے موقع پر سیاست دانوں اور نام نہاد لیڈران کی دوڑ دھوپ، شعلہ بیاں تقریر پھر اس میں بھلے مانوس لوگوں کو ترقی وخوشحالی کا پرفریب وعدہ وعید، روزی روزگار دلا کر ان کی دنیا بدل دینے کا سرسبز باغ دکھایا جاتا ہے۔ اس پر انھوں نے دلچسپ پیرائے میں طنز کیا ہے، اور صورت حال کی عکاسی کی ہے۔

''اس موسم میں انسانی ہمدردی، بھائی چارگی جی اٹھتی ہے۔ یہ تقریروں کا موسم ہے۔ اس موسم میں دنیا کی طویل سے طویل تقریریں ہوتی ہیں۔ قوم کی زبوں حالی اور ملک کے افلاس کے رقت آمیز مرثیے سنائے جاتے ہیں۔ ہر گلی کے موڑ پر ایک پٹرومکس کی روشنی میں سو دو سو سامعین نہ ملیں تو صرف ایک دو راہ چلتوں کو پکڑ کر دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر مچھ آنسو بہانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان تمام تقریروں کا خلاصہ اور لبّ لباب صرف یہی ہوتا ہے کہ ''مائی باپ! مجھے یا میرے امیدوار کو ووٹ دیجیے۔'' موقع پرست اور پیشہ ور مقررین کا یہ خاص موسم ہے۔ یہ لوگ بریانی کھاتے ہیں۔ دودھ پیتے ہیں۔ پھول پہنتے ہیں۔ لونگ اور سعالین کھا کھا کر تقریریں کرتے ہیں۔ کبھی 'مرغ' کو تیار کرتے ہیں۔ کبھی 'ترازو' کو شہ دیتے ہیں۔ یہ دونوں کے راز دار ہوتے ہیں۔ اسی لیے دونوں کو خوب لڑاتے ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک اچھی سی رقم کی امید پر آپ 'مرغ' کو ذبح کر کے 'ترازو' کے پلڑے زمین سے اٹھا کر آسمان سے ملا رہے تھے۔ کمیشن میں کمی جو نظر آئی تو فوراً ڈنڈی مار دی۔ اور 'مرغ' مردہ کی مسیحائی فرمادی۔ مرغ کو زندہ کر دیا۔ 'بانگ سحر گاہی' کی اہمیت پر ایک فلک شگاف دلدوز نعرہ مار دیا۔ ''لوگو! مرغ ہی تمھارا صحیح رہنما ہے۔ اے خفتہ نصیبو! تم کو اس کی گداز آواز کی ضرورت ہے۔ یہ نہ پکارے گا تو پھر صبح نہ ہوگی۔ تم اندھیرے میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گے اور سورج کی ایک ایک کرن کو ترسو گے۔ ع

''پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی''

انھوں نے اسی مضمون کے تحت اخبار مالکان پر بھی زبردست چوٹ کیا ہے۔ چونکہ اس موسم میں اخبار مالکان کی بھی چاندی ہوتی ہے۔ اور جو اخبار منظر نامے سے غائب ہو چکے ہوتے ہیں وہ بھی اس موسم میں زندہ ہو کر کسی نہ کسی امیدوار کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس پر سلیمان خطیب کس طرح طنز کرتے ہیں، دیکھیے:

''مردہ اخبار زندہ ہوتے ہیں۔ زندہ اخبار تروتازہ ہوتے ہیں۔ نئے چوزے نکلتے ہیں۔ نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ نئے پھول کھلتے ہیں۔ موسم ختم ہوتے ہی یہ موسمی پھول بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اخبار بند ہو جاتے ہیں۔ اور سال بھر کا چندہ دینے والے دوست احباب یہ مصرع اس مرحوم اخبار کی لوحِ مزار پر لکھ کر صبر کر لیتے ہیں۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اس ضمن میں امیدوار کے رویہ کی عکاسی کرتی ہوئی ان کی یہ تحریر بھی لائقِ توجہ ہے ساتھ ہی ایک امیدوار کی تقریر کا اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

''ظالم الیکشن میں جو بھی اُمیدوار کھڑا ہوتا ہے۔ گھر کا گھر بیٹھ جاتا ہے۔ بعض اُمیدوار کھڑے ہوتے ہیں تو برس کے بارہ مہینے کھڑے ہی رہتے ہیں۔ بیٹھنے کو زمین پر جگہ نہیں ملتی تو اپنے باپ دادا کی زمین بیچ دیتے ہیں۔ اس پر بھی نہیں چلا تو زمین کے پیوند ہو جاتے ہیں۔ الیکشن کے دربار میں امیدواروں کے قصیدے دل کھول کر پڑھے جاتے ہیں۔ کف پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ جادو بیاں مقررین کی، جو ہر امیدوار کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہوتے ہیں''

اس سلسلے کی ایک تقریر کا حصہ آپ کی نذر ہے:

''حضرات! میں جام صاحب کے باپ دادا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ سڑے آم صاحب کے چھوٹے بھائی اور کھٹے انار خاں کے سالے اور کڑوے کریلے کے داماد ہیں۔ ان کی ساری عمر کیڑے ڈالنے میں گذر گئی۔ اب کہاں الیکشن لڑیں گے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اپنی بیوی بلبل بیگم کو شکرے خاں جو اٹھا کر لے گیا ہے، اس غم کو غلط کرنے کے لیے اس میدان میں اترے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ان کو خود کوئی نڈر خاں اڑا لے''۔

ظرافت سے پُر ان کی یہ تحریر تھی۔ ان کے ایک مضمون سے منتخب اقتباسات بطور نمونہ میں نے پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کے دیگر مضامین بھی کافی دلچسپ اور پُر مزاح ہوتے ہیں۔ اور ان

میں عبرت بھی ہوتی ہے، نصیحت بھی۔ حقیقت بیانی اور نقاب کشائی بھی............۔

دکنی زبان اور سلیمان خطیب:

جب دکن میں اردو زبان کے پھلنے پھولنے کی بات آتی ہے تو سید بندہ نواز گیسو دراز کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے معراج العاشقین کے نام سے تصوف کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا تھا، جو نہایت عام فہم اور عوامی مزاج کے مطابق تھا۔ اور یہ اردو میں دکنی نثر کا پہلا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر دوسرے صوفیا کے نام بھی آتے ہیں جنھوں نے عوام میں تبلیغ و اشاعت کا کام وہاں کی عوامی زبان میں انجام دیے۔ لہٰذا میران جی شمس العشاق، برہان الدین جانم وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اسی عوامی زبان جسے ہندی یا ہندوی کہتے تھے، کو وسیلۂ اظہار خیال بنا کر نظم و نثر میں صوفیانہ باتیں اور مذہبی نکات بیان کیے جاتے تھے۔

بزرگوں اور صوفیا کے بعد مختلف ادوار میں اس زبان کو بہمنی سلطنت، عادل شاہی، اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستانہ توجہ حاصل رہی، ان درباروں سے جڑے ادبا و شعرا نے اس کی خوب آبیاری کی۔

دکنی ادب کے ابتدائی زمانے ہی میں دکن کے مشہور شاعر مُلّا وجہی نے نثر میں تاج الحقائق پھر سب رس لکھ کر دکنی ادب کو نثر کا شاہکار شہ پارہ دیا۔ سب رس اخلاقی اور صوفیانہ رنگ کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ زبان صاف ستھری اور خالص دکنی لب ولہجہ میں ہے۔ اسی طرح دکن کی پہلی طبع زاد مثنوی قُطب مشتری ہے، سب رس کی تصنیف کا زمانہ 1635 ہے۔

سلیمان خطیب نے جہاں زندگی بسر کی، وہ دکن کا حصہ رہا ہے اور مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حسن شاہ گنگو بہمنی نے جب اپنی سلطنت قائم کی تو گلبرگہ کو دارالسلطنت بنایا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز یہیں سکونت پذیر رہے اور اب مدفون ہیں۔ سلیمان خطیب میں یہاں کا ماحول آب و ہوا، زبان، لب ولہجہ رچ بس کر جز و ذات بن گیا تھا۔ ان کی ہر ادا میں دکن کی نفاست جھلکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دکنی زبان پر فطری طور سے عبور حاصل تھا۔ اور اس پر انھیں ناز بھی تھا۔ وہ فصیح اردو بھی جانتے تھے، لیکن تقریر یا تحریر میں دکنی زبان کے استعمال کو ترجیح دی۔ اس کی پاسبانی اور آبیاری کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اپنی کتاب 'کیوڑے کے بن' میں ان باتوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''میرا ماحول دکنی تھا۔اس لیے میں نے دکنی زبان اپنائی۔میری شاعری کا مزاج بھی دکنی ہے۔اس کی تشبیہات دکنی ہیں۔روزمرہ کے محاورے دکنی ہیں۔رسم ورواج دکنی ہیں۔زبان کا بانکپن بھی دکنی ہے۔میں نے ساکن لفظ کو دکنی کے انداز میں بھی متحرک باندھا۔قوافی سے بغاوت کی ہے۔یا صوتی اعتبار سے الفاظ استعمال کیے ہیں۔''

اسی طرح ملنسار اطہر کے نام ایک مکتوب (مورخہ 19/9/78) میں اپنی عاجزی وانکساری کا اظہار یوں کیا ہے:

''میں دکنی زبان کا شاعر ہوں،اور عوامی شاعر ہوں۔میں نے جو کچھ لکھا ہے،وہ عوام کے لیے لکھا ہے۔.........پھر لکھتے ہیں''میرا انداز بیاں بالکل سیدھا سادا دکنی ہے۔سہل ممتنع کے قریب قریب۔جس میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔مزاح کی چاشنی ہے۔مجھے جدید اور قدیم ادب کی ترازو میں مت تولو،کسانوں کی،مزدوروں کی اور عوام کی صف میں شامل رکھو۔اور ان کا شاعر لکھو۔یہی بس ہے۔''

پروفیسر رؤف خوشتر نے اس ضمن میں تحریر کیا ہے کہ یہ بڑی بات ہے کہ خطیب مرحوم نے عام مذاق کی پروانہ کی اور اپنے مخصوص ومنفرد رنگ کی پیروی کرتے رہے۔انھوں نے لوک گیت ودکنی شاعری کو اسی والہانہ انداز میں چاہا،جس طرح محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کو چاہا تھا۔اور اس کی یاد میں بھاگ گیا۔مگر یہ خطیب صاحب نے 'کیوڑے کا بن' اپنے خونِ جگر سے سینچ کر دکنی شاعری میں مہکایا۔چونکہ ان میں تخیل کی اونچی اڑان،جذبے کی گہرائی،احساسات کا اچھوتا خزانہ اور مشاہدۂ فطرت کا بڑا ذخیرہ تھا،اور چاہتے تو اردو شاعری کے روایتی شاعر کی طرح غزل کی زلفیں سنوارنے میں اپنا کلام صرف کرتے۔لیکن شہر سے دور افتادہ پانی محل میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود سماج کے نچلے واوسط طبقوں کی زبوں حالی دیکھ کر بے اختیار چیخ اٹھے اور عوامی

زبان میں ان تمام مسائل کو اس خوبصورتی سے سمو دیا کہ وہ لافانی بن گئیں۔''

پروفیسر رؤف خوشتر اپنے مضمون میں آگے چل کر یہاں تک رقم کرتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ معانی، اور نظیر اکبرآبادی کے بعد اردو شاعری میں ہندوستان کے دیہات کے باشندے اپنے رسموں، رواجوں، تیوہاروں، پستیوں اور بلندیوں کے ساتھ خطیب کی شاعری میں زندہ ہو اٹھے۔ یہ دوسرے تمام معاصرین دکن (علی صاحب میاں، نذیر دہقانی، اعجاز کھٹا، سرور ڈنڈا، حمایت علی حمایت) میں منفرد و محترم ہیں۔

سلیمان خطیب نے نظم و نثر کے توسط سے دکنی زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ اس پر پروفیسر مجید بیدار، اپنے ایک مضمون بعنوان 'سلیمان خطیب کی شاعری میں المیہ اور طربیہ پیکر کی حسن آفرینی' میں منفرد منظر نگاری کا سہرا ان کے سر رکھتے ہوئے ان کے کلام کو پیکر تراشی کا لاثانی نمونہ قرار دیا ہے:

> ''اردو کی ادبی زبان سے قبل دکنی لب ولہجہ کو بیشتر شعرا نے لچری زبان اور غیر معیاری زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ لیکن بہمنی دور سے لے کر مغلوں کی دکن میں آمد تک جس زبان نے اپنے وقار کو برقرار رکھا، اور سولھویں صدی کے اواخر میں دم توڑ کر پھر بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ارتقائی مراحل طے کیے۔ اس زبان کو دکنی زبان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جسے مغلوں نے دکن کی فتح کے بعد یکسر معدوم کر دیا لیکن بیسویں صدی کے نصف اوّل کے ساتھ ہی اس زبان کو دوبارہ معیار کا درجہ حاصل ہوا۔ دکنی شاعری کو عصرِ حاضر میں بہ یک وقت المیہ اور طربیہ محاکاتی خصوصیات اور پیکروں سے وابستہ کرنے والے اہم شاعر کی حیثیت سے سلیمان خطیب کا نام ہمیشہ سر بلند رہے گا۔ جنھوں نے دکن کے بہمنی دور کے دارالسلطنت گلبرگہ میں اپنی زندگی گذارتے ہوئے مختلف نثری اصناف کی نمائندگی کی۔ اور آخر میں دکنی شاعری کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے کیفیاتی فضا کو دکنی شعر میں سمونے اور اشعار کی دلکشی کو برقرار رکھنے کے ہنر کا مظاہرہ کیا۔ دکنی لب ولہجہ کے ساتھ منفرد منظر نگاری کی بنیاد رکھی۔ جسے

بلا شبہ المیہ اور طربیہ پیکر تراشی کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔"

حاصل یہ کہ جس زبان نے ابتدائی مرحلہ میں بزرگان دین، صوفیائے کرام کی آغوش میں ہوش سنبھالا، پھر اس کی پرورش امرا و سلاطین شعرا اور دیگر اہل ذوق کی زیر سرپرستی رہی اقبال اور ادبار کے دور سے بھی گزری۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اوّل زمانہ میں سلیمان خطیب اس زبان کی آبیاری کا بیڑا اٹھا کر پاسبان زبان دکن کی سنہری کڑی کا اہم حصّہ بن گئے۔ اور اپنے موروثی زبان کے تحفظ و بقا کی راہ ہموار کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔

شعری خدمات کے علاوہ سلیمان خطیب نے ساؤتھ انڈیا اردو اکادمی گلبرگہ کی داغ بیل ڈالی۔ علاوہ ازیں کرناٹک ہندی پرچار سبھا (گلبرگہ) کے نائب صدر و مراٹھی ساہتیہ منڈل گلبرگہ کے رکن کی حیثیت سے بھی خدمات لائق ستائش ہیں۔ حکومت کرناٹک نے ان کی خدمات کے اعتراف میں 1974 میں راجیوتسوا ایوارڈ سے نوازا۔ پھر 1975 میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اعلیٰ پیمانے پر 'جشنِ خطیب' کا اہتمام کیا۔ اسی موقع پر ان کا مجموعۂ کلام کیوڑے کا بن، زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا، اب تک کئی ایڈیشن نکلنے کے باوجود ملک و بیرون ملک میں بھی اس کی مانگ ہے۔

زندگی بھر طنز و مزاح اور ظرافت کے ذریعے قہقہے لگانے پر مجبور کرنے والا، طبیعت کو شاداں اور خوش و خرم رکھنے والا 1978 میں بالآخر راہیِ ملک عدم ہو کر سب کی آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب دے گیا۔ جن کی مجلس میں پہنچ کر سارے غم کافور ہو جاتے تھے، دنیا کے جھمیلوں سے دور مسرت و شادمانی کا ایک حسین ماحول ملتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے چاہنے والوں سے روپوش ہو گئے۔ ع

جو بیچتے تھے دوائے دل یہاں
وہ دکاں اپنی بڑھا گئے

مختار احمد منو کے مطابق مرحوم نے یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ ان کی تدفین خواجہ بندہ نوازؒ کے پاؤں تلے ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عُرس کے موقع پر سماع خانہ میں سمینار چل رہا تھا۔ سمینار کے ناظم وہاب عندلیب نے سمینار کی کارروائی روک کر خبر دی کہ ممتاز دکنی شاعر سلیمان خطیب اب اس

دنیا میں نہیں رہے۔ نماز جنازہ احاطہ درگاہ، اور تدفین پائیں میں ہوئی۔

ان کی وفات سے ادبی حلقے میں کہرام مچ گیا، شعرا وادبا نے اپنے حزن وملال کے اظہار و خراج عقیدت کے طور پر مرثیے وقطعات تاریخِ وفات کے نذرانے پیش کیے۔

وفات کے بعد ان کے فکر وفن کو زندہ رکھنے اور آنے والی نسل تک پہنچانے کے لیے کچھ عملی اقدام کیے گئے ہیں۔ ان کے مزاحیہ کلام کا آڈیو کیسٹ تیار ہوا ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی نے کیوڑے کا بن کا منظوم ترجمہ کرا کر شائع کیا ہے۔ ان کا کلام پھر اردو سے کنڑ میں منتقل کیا گیا ہے، مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر شمیم ثریا نے اپنے والد کی حیات وخدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ مختلف مقامات سے کئی جرائد ورسائل نے ان کی یاد میں خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ نیز ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے 1989ء میں ان کے نام سے تعلیمی وثقافتی امدادی ٹرسٹ بھی قائم کیا گیا ہے، جو سرگرم عمل ہے۔ ان کے نام سے ویب سائٹ بھی تیار ہے، جس سے راست استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ حال ہی میں (ستمبر 2013) اردو اکاڈمی نے جناب وہاب عندلیب کی مرتب کردہ کتاب 'سلیمان خطیب: شخص، شاعر ونثر نگار' کا اجرا پندرھواں کل ہند اردو کتاب میلہ میں کیا ہے۔

سلیمان خطیب، تنقیدی وتجزیاتی مطالعے کی روشنی میں:

سلیمان خطیب کی شخصیت وخدمات کا مختلف ادبا وناقدین نے تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ کیا ہے، الگ الگ زاویے سے فنی اصولوں پر جانچا پرکھا ہے، تحقیق ومطالعے کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا مطالعہ فنی اعتبار سے سلیمان خطیب کی شخصیت اور ان کے فن کی قدر وقیمت کا احساس دلاتا ہے۔

عزیز اللہ بیگ، وظیفہ یاب آئی اے ایس آفیسر، نے کیوڑے کے بن کا گہرائی سے تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اور اس پر مبنی مبسوط مضمون بعنوان 'دکنی شاعر سلیمان خطیب ایک مطالعہ' حاصل مطالعہ کے طور پر تحریر کیا ہے۔ انھوں نے سلیمان خطیب کی شعری تخلیقات کو بنیادی طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں سماجی ناہمواری، انسانی رشتوں کے مضحک پہلوؤں اور اس سے پیدا ہونے والے تناؤ کی تصویر کشی، ساس، بہو، میاں بیوی، باپ بیٹے، مالک

اور نوکر کے درمیان ہونے والی نوک جھوک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے ہوالے تلخ اور کبھی دلچسپ پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔

دوسرا حصہ وہ ہے جہاں شاعر نے مناظر فطرت کو موضوع بنایا ہے۔گاؤں،ندی نالوں،کھیت کھلیان اور میدان ، پگڈنڈیوں کا ذکر ملتا ہے۔اس کی تصویر کشی انتہائی بے ساختہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے۔ان کی شاعری کا تیسرا حصہ رومانی شاعری کا ہے۔جوان کی نظر میں بالکل اچھوتے اور نرالے انداز میں ہے۔چوتھے حصہ میں خالص اردو شاعری کو رکھا ہے۔جس میں دکنی الفاظ ،محاورے اور تشبیہیں نہ کے برابر استعمال ہوئی ہیں۔اس زمرہ میں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں آتی ہیں۔

مزید انھوں نے سلیمان خطیب سے متعلق اپنی رائے قائم کی ہے ان کی نگاہ میں سلیمان خطیب کا مرتبہ طنز ومزاح کے شاعر کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ان کی شخصیت کو صرف طنز ومزاح کے شاعر تک محدود کرنے کو ان کے ساتھ ناانصافی قرار دیا ہے۔وہ انھیں ایک ترقی پسند شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔جو غریبوں ،کسانوں،مزدوروں اور مفلوک الحال انسانوں کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتے تھے۔

وہ ایک جگہ مزید لکھتے ہیں کہ سلیمان خطیب قلندرانی طبیعت کے مالک تھے۔اور غالباً لوگوں میں گھرے رہنا پسند کرتے تھے۔میلوں ٹھیلوں ،بازاروں اور دکانوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا راست مشاہدہ ان کا محبوب مشغلہ رہا ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہمیں سماجی حقائق کی اس قدر کھری اور اور سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ ان کی شاعری کو سماجی تاریخ نویسی کہا جاسکتا ہے۔

پروفیسر مجید بیدار نے سلیمان خطیب کو اپنے عہد کا سب سے بڑا نباض شاعر قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ'' چونکہ انھوں نے علمی و ادبی زبان کو شاعری میں وسیلہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اظہار خیال ہی نہیں کیا، بلکہ دیہاتوں ،قصبوں،اور دکن کے دور دراز کے علاقوں میں بسنے والوں کی زبان کو اظہار کا وسیلہ دے کر اس کی اہمیت کا جواز پیش کیا ہے۔

غرض ترقیات کی اکیسویں صدی میں دیہاتی شاعری کی مؤثر نمائندگی اگر کسی شاعر کے کلام میں موجود ہے تو وہ بلاشبہ سلیمان خطیب کا کلام ہے۔

ڈاکٹر پیر زادہ فہیم نے مضمون بعنوان 'سلیمان خطیب ،مشتاق احمد یوسفی اور میں' میں خطیب مرحوم کی شاعری کے تعلق سے لکھا ہے کہ ان کی شاعری میں تین نکات پائے جاتے ہیں،سماجی مسائل،روزمرہ اورالمیہ پرختم ظرافت سے بھرپور خطیب صاحب کی دکنی شاعری سامعین کو ہنسنے پر مجبور کرتی ہی ہے،دوسری طرف انھیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔اس کے علاوہ جو چیز خطیب صاحب کو اوروں سے جدا کرتی ہے،وہ ان کی مزاحیہ نظموں کا المیہ ہے۔مثلاً ان کی نظم، 'اٹھائیس تاریخ، کا اختتامیہ جس میں الم اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔'ایک کلرک کی بیوی نے اپنے شوہر کے انتقال پر اظہار خیال یوں کیا ہے: ع

یتا احسان ہم پوکر جاتے
تنخواہ لینے کے بعد مرجاتے

ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی نے سلیمان مرحوم کی مشہور نظم 'ساس بہو' کا لسانی وفنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ہر گھر کا موضوع ہے۔اس نظم میں جاہل ساس،اور تعلیم یافتہ بہو کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔موصوف نے نظم ساس بہو کو تین حصوں (ابتدائیہ،درمیانہ اور اختتامیہ) میں تقسیم کیا ہے،اور ہر حصے کے الگ الگ خصوصیات بیان کیے ہیں۔

ان کے مطابق شاعر نے اس نظم کو دو مختلف اور منفرد اسالیب میں پیش کیا ہے۔ساس کے ضمن میں جتنے شعر ہیں،سب کے سب ٹھیٹ دکنی اردو کے اور بہو کے لیے ٹھیٹ غیر دکنی زبان کا استعمال کیا ہے۔اس کے نتیجے میں دو کرداروں کی منفرد حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔جن میں تضاد ہے۔لیکن شاعر اس تضاد کو اپنے فن کے ذریعے یکسانیت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔یعنی عورت بہو،بیٹی یا ماں اور ساس کے روپ میں ہوکر مریم اور زہرا کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اطہر معز،گلبرکہ کی نظر میں سلیمان خطیب کا کلام ہندوستانی سماج کی ارضی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔ان کے کلام میں عام بول چال کی زبان کا استعمال ہے،جس میں ادبیت اور سنجیدگی کم ہی ہوتی ہے،لیکن سلیمان خطیب نے اسے اپنے خوبصورت استعاروں میں استعمال کر کے ثابت کردیا ہے کہ زبان چاہے جو بھی ہو،اظہار کے طور وطریقے اور اسے برتنے کے ہنر سے اس کی اہمیت وحیثیت اور تاثیر کا لوہا منوایا جاسکتا ہے۔سلیمان خطیب نے عام بول چال کی زبان کو

زندگی میں قید کر کے اسے عمر جاوداں عطا کی ہے، اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں اور وہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں:

ڈوبتے سورج کا نور ہوں دیکھو
اپنی غربت کا شام ہوں باشا
دم غنیمت ہے میرا دکھن میں
اپنے فن کا امام ہوں باشا

منتخب کلام

اٹھائیس تاریخ

(ایک کلرک کی بیوہ، میاں کی مزار پر)

روز لڑلڑکو جان کھا کھا کو
اچھا جنگل میں سوگئے آکو
منڈی کاٹی کو پہلے مرنا تھا
لے کو مٹھی میں جان بیٹھی ہے
ایسا مرنا بھی کیکا مرنا جی
گھر میں بیٹی جوان بیٹھی ہے
کتنے لوگاں کے پاواں پڑپڑکو
گھر سے میت کو میں اٹھائی ہوں
جینا مرنا تمارا قرضے کا
آج پھولاں ادھار لائی ہوں
یتا احسان ہم پو کرنا تھا
تنخواہ لینے کے بعد مرنا تھا

☆☆☆

عید کے دن

(ایک یتیم لڑکا اپنی ماں کی قبر پر)

تو چ بیگلا بنا کو چھوڑی ہے
غیر لوگاں کا کیا گلہ اماں
تیرا سایہ جو اٹھ گیا سر سے
کوئی سایہ نہیں ملا اماں
تیرے مرتچ مرگئی دنیا
کون جانے کدھر گئی دنیا
تیری تربت پہ موتیاں برسو
چار آنسو چڑھانے لایا ہوں
ننگے پاواں سے پھٹے کپڑیاں سے
عید کا کرنے سلام آیا ہوں
کون پوچھیں گے ہم یتیماں کو
کون آتا ہے غم اٹھانے کو
سارے لوگاں ہیں سب کتاباں میں
ماں کا سایہ نہیں زمانے میں

☆☆☆

الیکشن کا موسم

ہے الیکشن عوام کا موسم
جیسے جامن کا آم کا موسم
کچھ مسلسل کلام کا موسم
مینڈکوں کے زکام کا موسم
دست بستہ نمستے ہوتا ہے
بے سبب احترام کا موسم
دربدر کے طواف ہوتے ہیں
لیڈروں کے سلام کا موسم
آقا نوکر کے پاؤں دھوتا ہے
چند روزہ غلام کا موسم
کھانا ملتا ہے دام ملتا ہے
یہ ہے دانے کا دام کا موسم
لڑنا مرنا، جلوس، جئے کاری
ان کے کچھ انتظام کا موسم
کچھ گرجتے ہیں شیر پی پی کے
رند عالی مقام کا موسم

کوچے کوچے میں آج بھاشن ہے
کیا سہانا ہے شام کا موسم

☆

مرثیہ کردیا قصیدے کو
شاعرِ بے مقام کا موسم
آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہیں
دل کو دل سے پیام کا موسم
نام ڈوبے ہیں نام چمکے ہیں
گو الکشن ہے نام کا موسم
لال پیلی ہوئی ہیں دیواریں
گو نقشِ دوام کا موسم
الّو ٹھہرا ہے گدھا ٹھہرا ہے
کچھ مصور کے کام کا موسم
یہ بھی دیوار کا نوشتہ ہے
اب کے الّو کو ووٹ دینا ہے
آنے والی ہماری نسلوں کو
اسی الّو سے کام لینا ہے
یوں بھی الّو فہیم ہوتا ہے
اس کا پٹھا عظیم ہوتا ہے

☆☆☆

ماخذات

☆ سہ ماہی طنز و مزاح
سلیمان خطیب نمبر (جلد 3/شمارہ 1) جنوری تا مارچ 2012

☆ سلیمان خطیب: شخص، شاعر و نثر نگار
مرتب: وہاب عندلیب

☆ ویب سائٹ
www.sulaimankhateeb.com

محمود ایاز

کرناٹک کے مرحوم شعرا، ادبا، نقاد اور صحافیوں کی صف میں محمود ایاز ایک ایسی شخصیت کا نام ہے، جن کے ادبی سفر کا مشن اردو زبان وادب کو کمال عروج عطا کرنا اور صحافتی جنون کا مقصد صحافت کو اس کا کھویا ہوا وقار دلا تا رہا۔ انھوں نے اصول وضوابط کی جو پابند طرز زندگی، رکھ رکھاؤ، وضع قطع اور بود وباش اختیار کیا، اسے تاحیات برتا۔ ہر کام بحسن وخوبی انجام دینا ان کا مزاج اور مذاق تھا۔ حُسنِ جمال اور حُسنِ کمال قدرت نے یہ دونوں صفات ان میں اس طرح پیوست کردی تھی، جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ان کا وظیفۂ حیات رہا۔

حق گوئی ، بے باکی، وفا شعاری، بلند خیالی، دردمندی، غمگساری، ایفائے عہد، پابندیٔ وقت، توکل واحسان آپ کی شخصیت کے جواہر خاص اور عناصر ترکیبی تھے۔ حوادثِ زمانہ سے ہنس کھیل کر گذر گئے لیکن پائے استقامت میں لغزش اور عزم واستقلال پر آنچ نہ آنے دیا۔ طبیعت میں نفاست اور کھرا پن تھا۔ بے لوچ اور صاف گو تھے۔ مہمانوں، ملاقاتیوں اور احباب سخن کے ساتھ بڑے خلیق اور مہمان نواز تھے۔

محمود ایاز 1930 میں کچی میمن سیٹھ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نام محمود پایا، جو ادبی سفر کے ساتھ محمود ایاز ہوا۔ والد کا نام حمید سیٹھ اور والدہ کا نام ہاجرہ بائی تھا۔ والد تجارت

پیشہ تھے۔ان کی ساری دلچسپی تجارت پیشہ تک محدود تھی۔

محمود ایاز کی ابتدائی تعلیم ماں کی زیرنگرانی ہوئی۔وہ ایک نیک اور علم دوست خاتون تھیں۔اردو زبان وادب کا اچھا ذوق تھا۔علامہ اقبالؒ ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔علامہ کی کئی نظمیں ان کی نوکِ زبان تھیں۔محمود ایاز کو قوتِ حافظہ اور اردو سے شغف والدہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ حصولِ تعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں حفظِ قرآن کے ساتھ تجوید وقرآت کا درس لیا۔غلام احمد جو کہ رشتہ میں ماموں اور عمر میں قدرے بڑے تھے،کی سنگت نے اردو زبان سے تعلق کو جلا بخشا۔اردو سے اس ابتدائی راہ ورسم کے ساتھ ہی کچھ عوارض در پیش آ گئے۔کم سن ہی تھے کہ ٹانسلز کا مرض لاحق ہوگیا،جس کے نتیجے میں کم وبیش دو سال تک انھیں اسکول جانے سے روک دیا گیا۔کھیل کود تک سے باز رکھا گیا۔سخت طبّی نگہداشت میں رہنے لگے۔والدہ کا کمرہ جو ادبی کتابوں اور مختلف ادبی شہ پاروں کا خزانہ تھا،وہیں عارضی قید وبند کی زندگی گزارنا ایک مجبوری بن گئی۔حالانکہ یہ ان کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔جو عام طور سے بچوں کے لیے پڑھائی لکھائی کے ساتھ آزادانہ کھیل کود اور تفریح کا وقت ہوتا ہے۔لیکن محمود ایاز کے ساتھ جو کچھ ہوا،وہ خلاف معمول ہوا۔

ان کی زندگی کا یہ پہلو اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس قیدِ تنہائی کو محمود ایاز نے اسکول کے پر بہار مواقع،اساتذہ کی نظرِ شفقت ومحبت اور یاروں کی سنگت کے احساس محرومی کو علم و ادب سے وابستگی،اور کتابوں سے پائیدار رشتہ کی استواری میں تبدیل کر دیا۔اس قیدِ تنہائی میں کتابوں کو اپنا بہترین رفیق جانا۔زندگی کا یہ وہ موڑ تھا جب وہ ادب سے روشناس ہوئے اور ان میں ادب کی تخم ریزی ہوئی۔

غرض جب تک گھر میں محصور رہے،اس دوران کمرہ میں موجود ساری کتابیں کھنگال ڈالیں،بطور خاص جن کتابوں کو ماں نے ہاتھ لگانے تک سے منع کیا تھا،متجسس نگاہوں اور شوق مطالعہ کے جنون میں ان سے باز نہیں رہ سکے۔اور وہ کتابیں شوقِ مطالعہ کی تکمیل میں مہمیز کا کام کیا۔

اس طرح محمود ایاز اس کم عمر میں عارضی ایام اسیری کے دوران وقت کے قد آور ادبا و مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ سے سیراب ہو چکے تھے۔ان میں راشد الخیری،نذیر احمد،پریم چند،سجاد حیدر،اختر شیرانی،عبدالحلیم شرر اور حالی جیسے مصنفین کی کتابوں سے خوب مستفید ہوئے۔کتابوں کے

مطالعہ کا جنون ہی تھا کہ محض چودہ سال کی عمر میں مسلم لائبریری کے ممبر بن گئے۔ کتاب کی دنیا میں جب کوئی عمدہ کتاب آتی، اسے حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے۔ مطالعہ کرکے نہ صرف خود محظوظ ہوتے، بلکہ حلقۂ احباب میں اس کا تذکرہ و چرچا ہوتا، پھر اس پر مزے لے کر تبصرے کرتے۔

عائلی زندگی

محمود ایاز کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ جیسے وہ گھر کے باہر ہوتے، ویسے ہی گھر کے افراد کے ساتھ۔ میمن خاندان کے ایک متوسط گھرانہ سے تھے۔ جہاں حصول تعلیم کا بہت رجحان نہیں تھا۔ مگر اتنا جس سے تجارت پیشہ اور زندگی گذر بسر کرنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ بہن نہیں تھی، البتہ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ اس کا نام ابتدا میں ہارون تھا۔ بعد میں تبدیل ہو کر غلام حسین ہوا۔

محمود ایاز آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ کچھ نیا کر گذرنے کا حوصلہ اور جوش و امنگ طبیعت میں موجزن رہتا تھا۔ انھوں نے خود کو ذات برادری کی رسمی حد بندیوں اور ریت و رواج سے خود کو بالکل بے نیاز اور آزاد رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے نام کے ساتھ 'سیٹھ' کے لفظ کے اضافہ کو بھی گوارا نہ کیا۔ تلاش معاش کی سرگرمیوں میں خاص دلچسپی نہیں تھی۔ روزی روزگار کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر جولانئ طبع اور افکار و نظریات کی وسعتوں کو چھو کر ساری کائنات کا حصہ بننا ان کا خواب تھا۔ والد کو ہونہار فرزند سے امید بندھی تھی کہ مالی مشکلات فرد کرنے میں مدد کرے گا۔ لیکن ان کی امید بر نہیں آئی۔ تاہم جب گھریلو ذمہ داری کا بوجھ سر پر آیا تو ملازمت اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی حساس طبیعت اور نفاست پسند مزاج کو روزگار پیشہ راس نہیں آیا۔ والد کو ان کے اس شاہانہ مزاج اور نفاست پسندی سے شکایت رہنے لگی۔ دوست و احباب سے ملاقات بات، فکرِ سخن اور ادب کے موضوع پر گفت و شنید دن رات کا مشغلہ تھا، جس سے والد کو سخت کوفت ہونے لگی۔ حتیٰ کہ ایک دن غصہ میں ان کی بیاضوں کو گھر سے باہر پھینک دیا۔

شائستہ یوسف صاحبہ کے مطابق 1950 سے 1957 تک محمود ایاز زندگی کے سرد و گرم حالات سے گذرتے رہے۔ اسی دوران ان کی زندگی میں وہ موسم بہار بھی آیا جس میں زینب نامی خاتون سے تعلق خاص پیدا ہوا۔ یہ تعلق عشق کے روپ میں چند برسوں تک جاری رہا لیکن دو دلوں کا یہ رشتہ جو صیغۂ راز تھا، حقیقی روپ نہ دھار سکا۔ اور وہ ان کی زندگی کا حصہ نہ بن سکیں۔ ان کی جگہ

مریم فاضل نے لی۔ یہ ان کے دوست رشید فاضل اور عباس فاضل کی بہن تھیں۔ ان ہی کے توسط سے دونوں کے درمیان راہ و رسم قائم ہوا۔ تعلیمی امور میں ان کی راہ نمائی اور کتابوں کے لین دین سے دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی قربت، فکری آہنگی اور ہم خیالی رشتۂ ازدواج میں بدل گئی۔ غرض 27 دسمبر 1962 میں دونوں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔

قدرت نے محمود ایاز کو دو بیٹوں سے نوازا۔ جواد اور وصی۔ دونوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر جی جان سے محنت کی۔ جس طرح خود پابند اصول تھے، بچوں نے بھی اس اثر کو قبول کیا اور اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ بچوں کی تربیت میں بہت معتدل رویہ اختیار کیا۔ نہ بہت زیادہ سختی برتی، اور نہ بے جا چھوٹ دی۔ البتہ ان کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھا اور ان کے حلقۂ احباب پر نظر رہی۔ دونوں بیٹے اب صاحب اولاد ہیں۔ خوش اخلاقی، ہمدردی، سخاوت و فیاضی، ضرورت مندوں کی اعانت اور مہمان نوازی میں بالکل والد پر گئے ہیں۔ بھائی غلام حسین دوبئی میں گھر بسا کر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ 1981 میں مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے۔ اس حادثہ کے کچھ عرصہ بعد والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ والدہ پہلے ہی کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ حادثہ کے اس تسلسل نے محمود ایاز کو بڑی حد تک ملول اور دل گیر کر دیا تھا۔

غزل گوئی

محمود ایاز نے اردو سے اپنے رشتہ کو محض ایک حساس قاری تک محدود نہیں رکھا بلکہ اب وہ تخلیقِ ادب کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض 1942 میں باقاعدہ غزل گوئی کا آغاز کیا۔ 1945 میں جب جنگ آزادی کی گھن گرج سنی جا رہی تھی، وطن کے متوالے وطنِ عزیز کو آزاد کرانے کے جوش و خروش سے سرشار تھے، بلند حوصلگی اور عزم و استقلال کا ایک سمندر ان میں موجزن تھا۔ ادب میں ایک قسم کا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ فلک شگاف نعروں کی گونج سے دشمن کے دیوان لرزہ براندام تھے۔ انہی احساسات و جذبات سے تحریک و ترغیب پا کر میدان ادب میں قدم رکھا۔

شائستہ یوسف صاحبہ، جنھوں نے محمود ایاز کی زیر سرپرستی اپنا ادبی سفر شروع کیا، ان کے ادبی سفر کے اصل اسباب و محرکات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتی ہیں۔

''جب 1945 میں جنگ آزادی کی مشعلیں جلنے لگیں، اور ترقی پسندوں نے اپنے نعرے لگائے۔ اس زمانے میں آغا سروش چمنستان کے مدیر تھے اور قدوس صہبائی نظام کے مدیر تھے۔ نظام کو بھی کافی مقبولیت حاصل تھی اور ترقی پسندوں میں اس رسالے کی دھوم تھی۔ اس زمانے کی یہ باتیں سن کر خوشی ہوتی ہے کہ اردو کا صحافی، اردو کا قاری، اردو کا ادیب و شاعر کم از کم ایک بے جان کاٹھ کے پتلے کا کردار تو نہیں ادا کر رہا تھا۔ جس پر حالات کا، وقت کا، تہذیب و ثقافت کا زمانے پر کوئی اثر نہ ہو۔ آزادی کی تحریک اور وطن کی محبت میں ان حساس اور جذباتی لوگوں کا پر جوش مظاہرہ الفاظ کے دریائی بہا کر سمندر میں ملنے کی جسارت تو کر رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں اندر سے ایک انسان کو اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانے کی مہم سے کسی نہ کسی طرح جڑا ہوا ہے۔ اور اس کاروان کا حصہ ہے۔ ترقی پسند جلسوں کا انعقاد کرتے تھے اور اس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور سامعین کے ساتھ ساتھ ان کا پورا خاندان ان تمام حالات سے واقف ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے، اور کس نے کیا بات کہی۔ نظمیں بھی سنائی جاتیں، کہانیاں، افسانے، مضامین بھی پڑھے جاتے۔ لیکن یہ سبھی ایک محفل کے لیے مخصوص ہوتیں۔ اسی لیے ایک ایسا حلقہ تیار ہو رہا تھا، جسے اردو زبان سے لگاؤ اور محبت تھی۔''

غرض انہی حالات نے محمود ایاز کی خوابیدہ ادبی صلاحیت کے ساز کو چھیڑا اور جب ان کا یہ جوہر ابھرا تو وقت کے ابھرتے ہوئے شعرا کی صف میں شامل نظر آئے۔ فیض احمد فیض، بھی انہی دنوں ابھرے۔ محمود ایاز کی شاعری ادبی حلقے میں پسند کی گئی۔ ادبی رسالوں اور جریدوں میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ ان کا کلام ساقی، نگار، ادب لطیف اور چمنستان وغیرہ میں بھی چھپا۔

محمود ایاز نے فن شاعری میں فراق گورکھپوری کا اثر قبول کیا تھا۔ ان کے کلام محمود ایاز کی زبان زد تھے۔ ان سے یہ تعلق اور لگاؤ ان کی شاعری اور لب و لہجہ میں بھی جھلکتا تھا۔ لیکن انھیں اس

بات کا شدید احساس تھا کہ کوئی ان کی قابلِ اصلاح پہلو کی نشاندہی کرے جس کی اصلاح ہو سکے۔ ورنہ داد و تحسین دینے والے بہت تھے۔

اس کا سہرا 'سویرا' کے ایڈیٹر فکر تونسوی کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے ان کی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ فکر تونسوی نے محمود ایاز کو یہ کہہ کر اصلاح کی طرف متوجہ کیا کہ فراق کو کندھوں سے جھٹک دیجیے، آپ اچھی شاعری کرنے کے اہل ہیں۔ محمود ایاز کھلا ذہن اور وسیع ظرف کے مالک تھے۔ اپنی خامیوں کی نشاندہی پر نہ کبھی شرمندہ ہوئے اور نہ ترقی کی راہ میں اسے معیوب جانا۔ بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں محوی صدیقی سے اپنے کلام کی اصلاح لینے لگے تھے۔

شاعری کو محمود ایاز نے دل و جان سے اپنایا تھا۔ نہ تو اس میں ناموری کی غرض پوشیدہ تھی اور نہ ہی اس کا مقصد ٹائم پاس تھا۔ وہ شاعری کو اپنے ادبی ذوق و شوق کی تسکین کا سامان سمجھتے تھے۔ اشعار کی فنی باریکیوں، اہم نِکات اور الفاظ کی معنیٰ آفرینیوں سے خوب محظوظ ہوتے۔ اس کے باوجود انھیں اس بات کا شدید احساس رہا کہ شاعری جس درجہ انہماک اور اشتغال کی متقاضی ہے، جس قدر وقت اس کے لیے مطلوب ہے، وہ اس کا حق نہیں ادا کر سکے ہیں۔ چنانچہ جب ان سے اپنا مجموعۂ کلام شائع کرانے کو کہا گیا تو یہ کہتے ہوئے آمادگی ظاہر نہیں کی کہ

> ''میں نے جو شاعری کی ہے، وہ تو یوں ہی چلتے کھیلتے، اٹھتے بیٹھتے، کبھی کچھ لکھ لیا تو کچھ لکھ لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ جس طرح کے تقاضے میں آپ سے کرتا ہوں، اس سے بڑے تقاضے میں نے اپنے آپ سے کیے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ اس کا میں نے دس فیصد کا پانچ فیصد بھی حق ادا نہیں کیا۔ اس لیے میں یہ مجموعہ نہیں چھپواتا۔ اس لیے کہ اسے میں اپنا نہیں سمجھ سکتا۔''

محمود ایاز بحیثیت شاعر ایک خاص حلقہ جو ان کے حلقۂ احباب، معتمد رفقائے کار اور ادب نواز احباب پر مشتمل تھا، تک ہی معروف تھے۔ حالانکہ بحیثیت ادیب، مدیر اور بالغ نظر نقاد اردو دنیا پر اپنی دھاک جما چکے تھے۔ لیکن شاعرانہ پہلو پردۂ خفا میں تھا۔ لہٰذا ان کے معتمد رفقا بالخصوص ضیا میر نے انھیں اپنا مجموعہ کلام شائع کرانے کا مشورہ دیا، اس پر وہ یوں گویا ہوئے:

> ''شاعری میں نے اپنے لیے کی ہے۔ اور میں مطمئن ہوں۔ گنے چُنے دوست

میری شاعری کے قاری رہ چکے ہیں۔ ویسے بھی اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ میرا شعری مجموعہ بہت پہلے منظر عام پر آجانا چاہیے تھا۔ جب شعری مجموعہ شائع کرنے کے لیے میری خواہش تھی، اس وقت میرے پاس وسائل نہ تھے۔ مگر اب جبکہ وسائل کا کوئی کال نہیں ہے تو دل نہیں چاہ رہا ہے کہ میں اپنا شعری مجموعہ شائع کروں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد مغنی تبسم، خلیل مامون، حبیب اللہ اور دیگر چند دوستوں کا اصرار بڑھتا رہا تو انھوں نے 'ناتمام' کے عنوان سے اپنی شعری تخلیقات کا ایک مجموعہ مرتب کیا''۔

لیکن وہ بھی شائع نہ ہوسکا۔ اس سے بھی قبل اپنے منتخب کلام کا مجموعہ تیار کیا تھا اور اس کا نام 'سوزِ ناتمام' رکھا۔ اس کا اشتہار راقم نے ادبی رسالہ 'جنوبی ہند کا بہترین ادب'، (مطبوعہ پاسبان پریس، بنگلور، سنہ اشاعت 1958) میں پڑھا ہے۔ جو اس طرح ہے:

''جدید ادب کے معماروں میں ایک ایسا معمار بھی ہے۔ جس کے اندر دو شخصیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اور وہ ہے 'محمود ایاز' اردو کے مراکز سے کوسوں دور ریاستِ میسور جیسے ریگستان میں اس خوش نواحدی خوان کی مترنم اور پُرسوز آواز برسوں سے گونج رہی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک سوز پنہاں ہے۔ جس سے دل کی ہر رگ وجد میں آتی رہتی ہے اور دکھتی رہتی ہے۔ اور وہ اس سوز کو 'سوزِ ناتمام' کہتا ہے۔

اس جواں سال شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کی شاعری کا پرسوز نالہ

درد بھی ، درد کی آواز بھی
میرا نالہ میرا غمّاز بھی ہے

یہ مجموعۂ کلام مجلس ادب، بنگلور کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا تھا لیکن کسی سبب شائع نہیں ہوسکا۔

ان کی وفات کے بعد 'جناب عزیز اللہ بیگ اور خلیل مامون جو (سوغات کے معاون مدیر رہے ہیں) کی کوششوں سے 'نقش برآب' کے عنوان سے ان کا مجموعۂ کلام منظر عام پر آیا۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے، ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور گذرے دنوں کے واقعات کے اطراف گردش کرتی ہے۔ ان کی زندگی میں جو کچھ بیتا، اسے شعری پیرہن عطا

کیا۔ اس بات کا وہ خود ذیل کے الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

''اپنی شاعری ہماری ذاتی ملکیت ہے۔ جو ماضی کے دریچوں کو کھول کر ہمارے جذبات اور گذرے ہوئے لمحات کو گواہ بناتی ہے۔''

معروف ادیب شمیم حنفی نے 'نقش برآب' پر تبصرہ بعنوان 'محمود ایاز کی شاعری' میں محمود ایاز کی شعری حسیات، فنی کمالات اور فکری پرواز کا جائزہ لینے کے بعد ان کے کلام کی جو قدر و منزلت متعین کی ہے وہ ان الفاظ میں ہیں:

''ان کی شاعری مجموعی طور پر روح میں بسے ہوئے المناک تجربوں کی شاعری ہے۔ اس شاعری کا مزاج بظاہر رومانی ہے۔ یہ تجربے محمود ایاز کے اردو زبان کے جن پیرائیوں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں، ان پر فیض کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ لیکن ان کی بصیرت رومانی انقلابیت کے اثرات سے آزاد ایک اخلاقی فریضہ کے طور پر ادا کیے جانے والے مثبت تعمیری اور صحت مند جذبوں کے بوجھ سے جو بچی رہی تو اس لیے کہ محمود ایاز کی وابستگی کسی بیرونی تصور یا مقصد کے بجائے دراصل اپنی ذات سے تھی۔ اور ان کی شخصیت میں کسی طرح کی کھوٹ نہیں تھی۔ فکر محسوسات کی شکل میں اور زندگی کے تجربے احساسات کے طور پر ان پر جس طرح نازل ہوتے تھے، محمود ایاز کسی بیرونی عنصر کی آمیزش کے بغیر انھیں اپنے شعر میں منتقل کر دینا چاہتے تھے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں کہ

''شاید اسی لیے محمود ایاز کی شاعری کو ایک ساتھ ایسے مختلف المزاج حلقوں کی طرف سے بھی داد ملی، جن کا اختلاف اصولی تھا۔ ان کی غزلوں، نظموں کو سراہنے والوں میں سید احتشام حسین (مرحوم) بھی تھے اور آل احمد سرور بھی۔ ترقی پسند انھیں اپنا مخالف نہیں سمجھتے تھے۔ اور ترقی پسندی سے فکری دوری رکھنے والے انھیں اپنے آپ سے قریب سمجھتے تھے۔

ان کی شعری ہیئت پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں تواتر کے ساتھ لفظ اور بیان کا بھیس بدل بدل کے رونما ہونے والا احساس موت کے

تجربے سے ہی منسلک ہے۔یہی پیمانہ زندگی کی حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنتا ہے۔محمود ایاز کی پوری شاعری میں ملال آمیز متانت کی ایک فضا موت کے تجربے سے ان کی اسی وابستگی نے مرتب کی ہے۔وہ شاعری میں کھل کر رونے کے روادار کبھی نہیں ہوتے۔کھل کر ہنسنا تو خیر دور کی بات ہے۔غیر رسمی معنوں میں اس ستھری اور شائستہ کیفیت کو ہم محمود ایاز کے مزاج کی اشرافیت بھی کہہ سکتے ہیں۔
سچ پوچھیے تو اسی کیفیت نے محمود ایاز کے مٹھی بھر کلام میں شاعری کے سنجیدہ قارئین وناقدین کے لیے اتنی کشش پیدا کر دی کہ ان کے دور کی شاعری کے ہر جائزے میں ان کا نام بھی چمکتا ہے،محمود ایاز ماضی کے ادب اور اپنے عہد کے نمائندہ ادب کی بابت جتنا سنجیدہ تھے، وہ اپنی تحریروں،ترجموں،اشعار کی طرف سے اتنے ہی بے نیاز تھے۔''

محترمہ شائستہ یوسف اپنی تصنیف 'یادِ رفتگاں: محمود ایاز' میں ان کے تفہیم کلام اور مذاقِ سخن کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

''ہر شعر پر، ہر لفظ پر گھنٹوں غور کرتے، اچھی شاعری کسی کی بھی ہو، اتنا لطف اٹھاتے کہ دن بھر جو ساتھ ہوتا، اسے شعر یاد ہو جاتا، پسندیدہ اشعار کا ہر طرح سے مزہ لیتے۔کسی شعر میں روانی پسند ہوتی،تو کسی میں الفاظ کا استعمال،کسی میں فلسفہ،کسی میں خیال، جس میں ساری باتیں یکجاں ہوں تو کہتے،آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔طبیعت سیراب ہو گئی۔''

کرناٹک کے افقِ ادب کا نیّرِ تاباں 'سوغات'

محمود ایاز کو اردو زبان وادب سے گہری دلچسپی کے ساتھ انگریزی ادب کے مطالعہ کا بھی اعلیٰ ذوق تھا۔تازہ انگریزی ادب کے شوقِ مطالعہ نے انھیں ایک اچھا مدیر بننے میں مہمیز کا کام کیا۔بقول شائستہ یوسف 1940 کی دہائی کے اوائل میں دلی میں جو ماتم کناں ماحول تھا، نوحہ خوانی کی کیفیت تھی،اس سے محمود ایاز بری طرح متاثر ہوئے تھے۔1857 کی داستانِ الم پڑھ کر خود کو ان حالات اور تہذیب وثقافت سے وابستہ کر لیا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو سے ان کی محبت

اور فریفتگی اس حد تک بڑھی کہ وہ اردو کو ایک وسیع کینوس اور تناظر میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ دیگر ہم عصر عالمی زبانوں کی صف میں اردو کو بھی تہذیب و ثقافت کا بطور ایک اہم عنصر دیکھنا ان کا دیرینہ خواب تھا۔

اردو کے تعلق سے ان میں یہ بلند خیالی اور فکری پرواز انگریزی ادب کے مطالعہ سے آئی تھی۔ اس دور کے نامی گرامی مصنفین کی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ ہوا کرتی تھیں۔ اگر کوئی کتاب آسانی سے حاصل نہ ہوتی یا مالی مشکلات آڑے آتے تو سکنڈ ہینڈ کتاب خرید لیتے اور اس سے استفادہ کرتے۔ حتیٰ کہ بنگلور چھاؤنی میں مقیم فوجیوں کے لیے جو خاص ایڈیشن چھپتے تھے، جسے وہ پڑھ کر یا بنا پڑھے آدھی قیمت میں فروخت کر دیتے۔ محمود ایاز اسے حاصل کر کے مطالعہ کا حصہ بنا لیتے۔

> انھوں نے 1957 میں اردو ادب کی آبیاری کا بیڑا اٹھایا اور اردو ادب کے ایسے شاہکار ادبی مجلّہ سے اردو دنیا کو روشناس کرایا جو معیارِ ادب کے اعتبار سے وقت کا ممتاز مجلّہ شمار کیا گیا۔ مجلّہ 'سوغات' اور محمود ایاز ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ یہ ان کے اعلیٰ ادبی ذوق، وسعت مطالعہ اور فکری پرواز کا غماز تھا، جس نے انھیں عالمی شناخت دی۔ اور جب یہ ریاست کے افقِ ادب پر نیّر تاباں بن کر طلوع ہوا تو اس کی تابانی کے سامنے معاصر ادبی رسالوں کی روشنی مدھم پڑ گئی اور جن قلمکاروں کو اس میں چھپنے کا موقع ملا، خود کو خوش نصیب گردانا۔ سوغات کے لیے جو مضامین اور ادبی شہ پارے آتے، اسے اعلیٰ معیار کی کسوٹی پر جانچا پرکھا جاتا، بحث و تحقیق اور تبادلۂ خیال کے بعد ہی سوغات میں جگہ ملتی۔ بقول ضیا میر (مرحوم)
>
> ''سوغات میں اشاعت کے لیے آنے والی ہر ادبی تحریر پر ہم تینوں (محمود شریف، محمود سعید اور وہ خود) کافی بحث و مباحثہ کرتے، ہفتہ میں کم از کم ایک شام ہم تینوں مل کر گذارا کرتے، جو خالص ادب اور سوغات کے لیے مختص تھی۔''

علی حفیظ سوغات کے تعلق سے اپنا تاثر پیش کرتے ہیں کہ

''سوغات کے اجرا نے اردو ادب کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور اس کے اداریوں نے ادیبوں اور شاعروں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نیز محمود ایاز نے سوغات کا 'جدید نظم نمبر' شائع کر کے جہاں جدید نظم کی داغ بیل ڈالی، وہاں شاعر کے نام کو مخفی رکھ کر ہر نظم پر ایک سے زیادہ نقادوں سے تبصرہ کرا کے تنقید کو ایک نئی سمت بخشی۔ نقاد کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ جس نظم پر وہ تنقید کر رہا ہے، وہ کس کی کاوش ہے، اس شاعر کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے؟۔ وہاں نہ اقربا پروری کا کوئی سوال اور نہ ہی کسی شاعر کی کاوش پر بے جا تنقید کے لیے کوئی موقع۔''

انگریزی ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے محمود ایاز کا مذکورہ 'تنقیدی تجربہ' آئی اے رچرڈس (1979-1893) کے عملی تنقیدی تجربہ کی تقلید تھی۔ چونکہ رچرڈس جو انگریزی ادب کا پروفیسر، عظیم شاعر و نقاد تھا، اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھانے کے دوران یہی تجربہ اپنے شاگردوں کے ذریعہ کیا تھا۔ اس نے تیس نظمیں شاعر کے نام و عنوان مخفی رکھ کر دیے تھے۔ حتیٰ کہ طالب علموں کو یہ تک نہیں بتا گیا تھا کہ یہ نظمیں کس دور کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس تجربہ سے اس کا مقصد تنقید نگاری کے فن میں رائج کچھ قابلِ اصلاح پہلوؤں کی نشاندہی کرنا تھا۔ اس نے اس تجربہ کے بعد ادبی تنقید نگاری کے زریں اصول بھی مرتب کیے تھے۔ اس سلسلے کی تفصیلی معلومات کے لیے اس کی تصنیف 'عملی تنقید (Practical Criticism) جو 1946 میں لندن سے شائع ہوئی ہے، رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سوغات کے ذریعہ محمود ایاز ادب میں نئے ادبی رجحانات، میلانات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار متعارف کرانا چاہتے تھے۔ اردو والوں میں اپنی دنیا کے علاوہ عالمی سطح پر ادب میں کیا ہو رہا ہے، اس کا احساس و شعور بیدار کرنا ان کا ہدف تھا۔ ادب کو ذاتی مفاد اور خود غرضی کے لیے استعمال کرنے کے سخت مخالف تھے۔ سوغات کے توسط سے وہ ایک اور اہم کام لینا چاہتے تھے وہ یہ کہ معیاری ادبی ورثہ کو اسلام سے ایسا مربوط کر دیا جائے، جس سے اسلام کی صحیح تصویر اور اس کی پاکیزہ تعلیمات اجاگر ہوں۔ مسلمانوں کا اردو سے ایسا مستحکم رشتہ دیکھنا چاہتے تھے کہ گویا مسلمانوں کے

ساتھ اردو کا عقد ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مصاحبین اور رفقا کو اس بات کی ہدایت وتلقین کرتے کہ وہ اسلام اور جدیدیت کے موضوع پر کام کریں، جدید دنیا، انسانی مسائل اور اسلام، اصول وضوابط اور انسانی نفسیات واقدار جیسے موضوعات پر کام کرنے کے سلسلے میں انھیں ابھارتے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے تعلق سے ان کے افکار کتنے بلند، مقاصد کتنے نیک تھے۔

سوغات کو انھوں نے ہر طرح کے اثر ورسوخ یعنی سیاسی، سماجی، جماعتی اور مسلکی اجارہ داری سے محفوظ رکھا۔ سوائے ادبی خدمات کے کسی ذاتی فکر ونظر کا ہتھکنڈہ واجارہ داری کا منحوس سایہ اس پر پڑنے دیا اور نہ ہی مال ومنال کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے اصول اور معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ سوغات کی ادارت واشاعت کے سفر میں اس بات پر ہمیشہ کاربند رہے کہ ادبی رسالہ چونکہ اپنے عہد کا، لکھنے والوں کے فکر وفن کا آئینہ وعکس ہوتا ہے، چنانچہ قلم کاروں کا مشہور ومعروف ہونا لازمی نہیں، بلکہ تخلیقات کا بہترین ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور سراہتے۔ بقول شائستہ یوسف صاحبہ وہ سوغات کے لیے لوگوں کو خط لکھ کر مضامین منگواتے، اور بڑی مستعدی سے اس کا مطالعہ کرتے، جہاں ضرورت محسوس ہوتی، تصحیح کرتے، جہاں دوبارہ لکھوانا ہوتا، دوبارہ لکھواتے اور جو تحریر غیر معیاری اور بے جا معلوم ہوتی، لوٹا دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اس ضمن میں درج ذیل واقعہ، جو خود محمود ایاز نے نئے دور کے 'سوغات' شمارہ اوّل میں نقشِ اوّل کے تحت لکھا ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

> ''ابھی چھ ماہ پہلے ایک شاعر نے جو اچھے خاصے رسائل میں کبھی کبھی چھپتے رہتے ہیں، اپنی کچھ چیزیں سوغات کے لیے بھجوائیں۔ میں نے معذرت کے ساتھ لوٹا دیں۔ انھوں نے ثابت قدمی سے کام لیا اور دوبارہ کچھ چیزیں ارسال کیں۔ ان کی اشاعت میں بھی مجھے عذر ہوا تو انہوں نے لکھا کہ'' صاحب میں جانتا ہوں میری چیزیں آپ کے معیار کی نہیں۔ لیکن آج کے مقتدر ادبی رسائل میں جو چیزیں شائع ہو رہی ہیں، وہ سب کم وبیش ایسی ہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج اس سے بہتر لکھا نہیں جا رہا ہے۔ اور اگر ایسی چیزیں لوٹاتے رہیں گے، تو پھر 'سوغات' میں چھاپیں گے کیا؟۔'' مجھے یہ بات غور طلب بھی لگی اور

عبرت ناک بھی۔"

اسی کے ساتھ کسی قاری کا یہ تبصرہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ 'نقشِ اوّل' میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو معیاری کہانیاں 'سوغات' میں اشاعت کے لیے نہیں مل رہی ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ اس لیے نہیں کہ اچھی کہانیاں لکھی نہیں جارہی ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ کہانیاں آپ تک پہنچ نہیں رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نئے لکھنے والے سوغات کے معیار سے یا آپ اداریے میں جو تبصرے مشمولات پر کرتے ہیں، ان سے ڈر کر آپ کو افسانے نہیں بھیج رہے ہیں؟۔(سوغات ،شمارہ6/مارچ1994 بازگشت،صفحہ/570)

سوغات کا ادبی سفر بنیادی طور پر تین ادوار میں منقسم ہے۔ 1957 سے شروع ہوا، دوسرا دور پاکستان میں بتایا جاتا ہے، جب محمود صاحب پاکستان گئے۔ پھر تیسری بار ہندوستان سے شائع ہوا۔ لیکن پہلے دور میں کتنے شمارے نکل سکے، یہ ہنوز معمہ ہے۔ البتہ تیسرے دور کا آغاز 1991 سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ستمبر 1991 کے شمارہ میں نقشِ اوّل کے تحت محمود ایاز کی درج ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔

"سوغات کے نئے دور کی پہلی کتاب آپ کے پیش نظر ہے۔ آج کے دور میں اس نوعیت کے ایک ادبی رسالے کا اجرا اس بات کی مزید توثیق کرتا ہے کہ آدمی بنیادی طور پر غیر عقلیت پسند واقع ہوا ہے۔ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں برابر تخفیف ہوتی جارہی ہے۔ اور ہر سال مختصر تر ہوتی ہوئی تعداد کی اکثریت فقط مشاعروں، غزل کے کیسٹوں اور فلموں کی سطح پر اردو سے آشنا ہے۔ ایک سخت جان 'ہٹ دھرم' اقلیت ہے جو ابھی تک اردو کو ایک علمی ادبی اور تہذیبی سطح پر سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ لیکن وہ بھی کئے دن تک؟۔ بہر حال سوغات اسی مٹتی ہوئی اقلیت کے لیے ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ پہلے یہ سہ ماہی تھا، جو بعد میں شش ماہی کردیا گیا۔ اخیر میں لکھتے ہیں کہ سوغات کے دوبارہ اجرا کے محرک اول مغنی تبسم ہیں، اور ان کے زبردست تقاضوں کے باوجود یہ ممکن نہ ہوتا، اگر خلیل مامون اور عزیز اللہ بیگ

میرے دست و بازو نہ بن جاتے۔ انھیں دوستوں کے تعاون سے سوغات کا
دوبارہ اجرا ممکن ہوا ہے۔"

اس سے واضح ہو گیا کہ سوغات کے یہ تیسرے دور کا آغاز تھا۔ راقم السطور کو بالترتیب 1991 تا 1994 تک کے شمارے ملے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آ کر سوغات کا سفر ختم ہوتا ہے۔ شائستہ یوسف صاحبہ بھی لکھتی ہیں کہ تیسرے دور میں صرف چار شمارے نکلے، وہ بھی محمود ایاز کی نظر میں تسلی بخش نہیں تھے۔

اس کے برعکس پہلے دور کے شمارے، پہلے شمارے ہی خوب سے خوب تر تھے۔ پہلے دور کے شماروں میں دوسری زبانوں سے ادب اردو زبان میں منتقل کیا جاتا تھا، جو دنیائے اردو کے لیے ایک نئی نعمت ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کام ممتاز شیریں نے شروع کیا تھا لیکن اس کا صحیح حق محمود ایاز نے ادا کیا۔

تلاش بسیار کے بعد پہلے دور کے سوغات کا تیسرا شمارہ ہاتھ لگا۔ لیکن اس میں کہیں بھی سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ضخامت 186 صفحات، قیمت فی پرچہ دو روپے درج ہے۔ پاسبان نمبر 27/کلائن روڈ پاسبان برقی پریس کا مطبوعہ ہے۔ معلوماتی مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں اس دور کے ادبی معیار کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مشمولات کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ البتہ نقشِ اوّل میں محمود ایاز کی چشم کشا تحریر اور مشمولات پر ان کے معنی خیز تبصرے نے اس کی اہمیت و افادیت کو دو بالا کر دیا ہے۔ مشمولات میں جان لیہمن کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے جو شامل اشاعت ہے یہ ایک تاثراتی نوعیت کا مضمون ہے جس کا مقصد جیمس جوائس سے متعارف کرانا اور دلچسپی پیدا کرنا ہے۔

سوغات پر قارئین کے کلمات تحسین

سوغات ہند و پاک کے مختلف گوشوں کو جاتا تھا۔ بازگشت کے تحت قارئین کے جو تاثرات اور تحسین کے کلمات ملتے ہیں، اس سے اندازہ لگتا ہے کہ اس وقت کے حالات آج سے کہیں مختلف تھے اس دور کے قاری بیدار مغز اور رد و قبول کا احساس و شعور رکھتے تھے، نیز اس پر تبصرہ کرنے کا حوصلہ بھی ان میں تھا۔ پہلے دور کے سوغات شمارہ/3 کے بازگشت میں عصمت چغتائی، آل احمد سرور، اثر

لکھنوی، عبدالمجید حیرت، مظہر امام، باقر مہدی، بشیر بدر، شفیق فاطمہ شعریٰ اور معین انور نے تاثرات لکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

''سوغات کا دوسرا شمارہ ملا، پہلا شمارہ یا تو ہاتھ آنے کے بعد کوئی صاحب اڑا لے گئے یا پہنچا ہی نہیں۔ جب خاندان میں کوئی خوبصورت بچہ پیدا ہوتا ہے، تو نظر بد سے بچانے کے لیے اس کے حُسن کی تعریف نہیں کرتے۔ میں بھی اپنی بڑی بوڑھیوں کے چلن پر نظر رکھتے ہوئے سوغات کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ کہتے ہیں دیر سے پرچہ شائع ہونے کی ذمہ داری لکھنے والوں پر آتی ہے۔ حضرت! یہ سراسر دھاندلی ہے۔ جب تک آپ کے پاس تین پرچوں کا مواد جمع نہ ہو جائے، نکالیے ہی نہیں۔ اور ان میں سے جب ایک شمارہ نکل آئے، تو پھر تین کا اندوختہ پورا کر لیجیے۔ مضمون کے لیے آپ الٹی میٹم دے کر ہاتھ پیر پھلا دیتے ہیں۔ براہ کرام کسی کے مضمون کو بھی ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دیجیے کہ اس کے بغیر رسالہ نہیں نکلے گا۔ یہ سن کر تو بالکل انسان حواس باختہ ہو جاتا ہے، اور کہانی موجود بھی ہو تو سیجئے جی سے ڈرتا ہے کہ ہیں 'خوان بڑا خوان پوش بڑا' والی چیز نہ ثابت ہو۔ بہر حال ابھی تو تین مہینے میں نیا شمارہ نکلنے میں کچھ لکھ ہی جائے گا جب تک............(عصمت چغتائی)

''......مضامین پر اظہار خیال کے بعد......'' آپ کے تینوں تبصرے تبصرہ نگاری کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور ان میں مطالعہ اور نظر دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ خصوصاً جیمس کے ترجمے پر تبصرے۔ آپ نے ایک سنجیدہ ادبی پرچہ نکالا ہے۔ اسے جاری رکھیے، ممتاز مضمون نگاروں یا شاعروں پر تکیہ غلط ہوگا۔ اگر اچھے مضمون نہیں ملتے تو خود لکھیے۔ یقین جانیے، آپ کے مضامین اچھے ہوں گے تو شوق سے پڑھے جائیں گے۔ اب تک آپ کی لکھی ہوئی جو چیزیں نظر سے گذریں، ان سے خوشی ہوئی۔ میں مضمون میں اپنے خیالات سے مطابقت نہیں، معیار دیکھتا ہوں اور یہ خوشی ہے کہ سوغات کا معیار بلند ہے۔ بنگلور سے 'نیا دور' بھی بہت اچھا نکلا تھا، مگر امید ہے کہ 'سوغات' اس سے

زیادہ اچھا ثابت ہوگا''۔.................(آل احمد سرور)

''آپ کے تبصرے بہت بے لاگ ہوتے ہیں۔ بہت پسند آئے۔ مگر عجب نہیں بعض شاعر و ادیب حضرات کو کچھ ناگوار گذرے، اگر ایسا ہو تو باشد۔ آپ تو وہی کہیں جو محسوس کریں۔ آپ کے قلم سے جہاں جہاں اشعار کا انتخاب ہوا ہے، خوب ہے۔ آپ کے ستھرے مذاق کی دلیل ہے۔ مثلاً آپ کا یہ شعر،

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت

(عبدالمجید حیرت)

''سوغات کے ادبی وقار کا اندازہ پہلی ہی نظر میں ہو جاتا ہے۔ رسالہ کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اڈیٹر نے اڈیٹر بننے کے شوق میں اسے جاری کیا ہے۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو کچھ کہنا ہے، کچھ پیش کرنا ہے۔ آپ کا اداریہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ممکن ہے مجھے آپ سے سوفی صد اتفاق نہ ہو، لیکن میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ کاش اردو کے رسائل اداریے کی اہمیت کو سمجھیں۔ آپ کا یہ شعر واقعی پسند آیا،

خود ہم سے نباہی نہ گئی پیار کی رسمیں بچھڑے ہیں تو اب گردشِ دوراں کے گلے ہیں

سوغات کو جاری رہنا چاہیے''۔............(مظہر امام)

''سوغات اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے۔ جب ایڈیٹر خلاق بن جاتا ہے۔ رسالے کے تمام مواد کو وحدت کا روپ دیتا ہے۔ اس میں روح پھونکتا ہے۔ اس خلاقی سے بڑی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک ذہنی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہ وہ فضائے موعود ہے، جس کے قائم ہونے کا اس عہد میں ہر صاحبِ نظر کو انتظار تھا،

رود کا دیری کے زنگ خرام از تو ی آید مرا بوئے مرا

(شفیق فاطمہ شعریٰ)

محمود ایاز بحیثیت ادیب، نقاد اور تبصرہ نگار

اردو زبان و ادب سے محمود ایاز کی انسیت اور لگاؤ لازمۂ حیات کی حد تک تھا۔ اردو ان کا

گوشت و پوست تو ذوقِ ادب، نکتہ سنجی اور معنیٰ آفرینی ان کے ادبی شخصیت کی روح پر سوز تھی، جس کے دم سے ان کے جولانیِ قلم کو روانی، ادب کے ذوقِ لطیف کو سیرابی اور نفیس طبیعت کو شگفتگی ملتی تھی۔ محمود ایاز کو بحیثیت ادیب، نقاد اور تبصرہ نگار دیکھتے ہوئے ان کے ادبی رجحان و میلان کے ساتھ، اس سے ان کی غرض و غایت پر بحث کئی گوشوں کو اجاگر کرتا ہے۔ جیسا کہ شائستہ یوسف صاحبہ نے لکھا ہے انھوں نے جدیدیت کے نام پر بکواس کی کبھی تعریف نہیں کی۔ بلکہ بنیادی باتوں، روایتوں کا احترام کیا اور اس کی افادیت اور اہمیت کا احساس کروایا۔ زبان کی شیرینی اور چاشنی، اندازِ بیان، علامتیں ہوں کہ اضافتیں، ہر بات میں بنیادی پہلو کو ملحوظ رکھا۔ انہیں اس بات کا اعتراف بھی رہا کہ ساری عمر انھوں نے ادبی ذوق کی صحت برقرار رکھی۔ ساختیات پس ساختیات کا معاملہ ہو یا رومانیت، سماجی مافیا سوالات ہوں کہ وجودیّت کے دور میں ادب برائے ادب کی آواز یا جدیدیت، مابعد جدیدیت کی باتیں۔ ہر معاملے پر غور و فکر کرتے اور اپنے تجربات کی روشنی میں ان مباحث پر اپنے علم کی روشنی سے حق کا دائرہ وسیع کرتے۔

شائستہ یوسف کے ان تاثرات کی توثیق و توضیح میں محمود ایاز کی یہ پر مغز تحریر جو پہلے دور کے سوغات شمارہ 3 کے نقشِ اوّل میں ملتی ہے۔ اسی طرح ادبی رسالہ 'جنوبی ہند کا بہترین ادب' میں 'ادب اور سماجی تصور' کے عنوان سے شائع ہے۔ یہ دونوں مضامین ان کے بلند ادبی ذوق اور پاکیزہ رجحان و خیال کو تو اجاگر کرتا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے نقد و انتقاد کے اعلیٰ معیار، وسعت مطالعہ اور فخرِ روزگار مبصر ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

اوّل الذکر تحریر میں انھوں نے ہندوستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں نظریاتی چھان پھٹک، ادبی اقدار کے تعین، اپنے دور کے مطالبات اور تقاضوں کو سمجھنے اور معاصر تخلیقات کا جائزہ لینے کی سمت میں جو احساس و شعور بیدار ہو رہا تھا اسے لائقِ ستائش بتایا۔ لیکن اس دہائی کے صاحبِ قلم میں بہت سی بنیادی باتوں کے متعلق کوئی واضح نقطۂ نظر نہ ہونے پر سخت چوٹ کیا ہے یہاں تک فیصلہ صادر کر دیا کہ اب تک ان میں چیزوں کی جانچ پرکھ کے رد و قبول اور قدر و قیمت متعین کرنے کا کوئی معیار نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف فکر و اظہار کی آزادی کے مطالبہ پر مُصر ہیں۔ انھوں نے ان کے اس مطالبہ کو بھی نیک نیتی پر محمول نہیں کیا ہے، بلکہ اسے تن آسانی

قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں ترقی پسند تحریک ان کے ہدف تنقید سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس کے عائد کردہ پابندیوں کے خلاف احتجاج ورد عمل کی وکالت بھی کی لیکن وہیں یہ انتباہ بھی دیا کہ اگر یہ احتجاج غیر متعین سمت میں جاتا ہے۔ اور کوئی واضح مقصد متعین نہیں ہے، تو ان کا یہ عمل خود ان کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

لہٰذا درج ذیل اقتباس کے مخاطب اگر چہ اس دور کے ادبا و تخلیق کار ہیں۔ لیکن کم و بیش آج کے اصحاب قلم و احباب فکر و سخن پر بھی اتنا ہی منطبق ہوتا ہے جتنا کہ ان پر۔ چنانچہ یہ عبارت بہت سے بھٹکے ہوئے ذہنوں اور غیر واضح نقطۂ نظر رکھنے والے اصحاب قلم کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اور ان کے سوچ و فکر کی گتھیوں کو سلجھانے میں کار آمد ہو گی۔

> ''کسی بھی آمریت سے آزادی حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزادی کے استعمال اور اس کی حدود کا تعین ہی نہ کیا جائے۔ آزادی ہر قسم کی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کا نام نہیں، بلکہ ذمہ داری کے احساس کا نام ہے۔''

وہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ ادیبوں کی موجودہ نسل اس احساس ذمہ داری سے محروم ہے۔ اور ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ کو خود فریبی اور دنیا فریبی کے لیے تشکیک ذہنی، آزادی کی لگن اور فنی اقدار سے لگاؤ کا نام دیا جا رہا ہے۔

لہٰذا ان پر چوٹ کرنے کے ساتھ یہ صلاح بھی دی ہے کہ لکھنے والے انفرادی اور ذاتی طور پر ہی سہی، مگر اپنے فکر و احساس کی ایک واضح سمت مقرر کریں۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں متوقع انجام سے بھی آگاہ کر دیا کہ فن و ادب تو دور کی بات ہے خود ان کی اپنی شخصیتوں میں کوئی گہرائی اور گیرائی نہیں آ سکتی۔

اس کے ساتھ ہی انھوں نے آزادی کا مفہوم بھی واضح کیا ہے اور اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ آزادی ایک عام آدمی کے لیے کیا معنیٰ رکھتی ہے اور خواص کے لیے آزادی کا مطلب کیا ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

> ''ایک عام آدمی اور فنکار کی آزادی میں بڑا فرق ہے۔ عام آدمی کے لیے

آزادی کا مطلب غیر ذمہ داری اور اپنے نفس کے مطالبات کی تسکین ہے لیکن
ایک فنکار کے لیے آزادی کا مطلب کائنات کی ہر راحت اور آرام کو اپنے آپ
پر حرام کر لینے کا نام ہے۔ انھوں نے فنکار کے لیے 'رابنسن کروسو' کا استعارہ
استعمال کیا ہے، جو خود آگ جلاتا ہے اور خود اپنا کھانا بناتا ہے۔
غرض موجودہ نسل کے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں حریت فکر اور آزادیٔ اظہار
کی جو طلب نظر آ رہی ہے، وہ یقیناً ایک بہتر تبدیلی ہے۔ لیکن ان کے پاس اس
آزادی کے صحیح مصرف کا کوئی شعور ہے اور نہ انھیں پراگندگیٔ فکر اور آزادیٔ فکر کا
فرق معلوم ہے۔ اس کی بنیادی وجہ علم اور غور و فکر کی کمی ہے۔"

علاوہ ازیں محمود ایاز کی نگاہ دور رس اور تخیل پرواز فلک سیر تھی۔ حالات حاضرہ سے مستقبل کا اندازہ کرتے۔ ایجادات و اختراعات اور انکشافات کا جو سیلاب امڈ پڑا ہے، اس کے نتیجے میں سماج اور معاشرہ پر جو اثرات مرتب ہونے والے تھے، اس کا انھیں بخوبی فہم و ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب سے وہ اردو داں طبقہ کی ذہن سازی و تربیت کا کام لینا چاہتے تھے، تاکہ آنے والے کل سے انھیں خود کو ہم آہنگ کرنے اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہو۔ نت نئی ٹکنالوجی اور وسائل ذرائع سے مرعوب ہوئے بغیر اس سے استفادہ سے خود کو محروم، عاجز اور درماندہ نہ سمجھیں۔ ایسی صورت سے ہمکنار کرنے میں ایک تربیت یافتہ ذہن ہی کام آ سکتا ہے۔

اس ضمن میں اس 'مقولہ' سے انکار ممکن نہیں کہ ایک وقت تھا جب کہا جاتا تھا کہ 'جو جس قدر کم جانتا ہے، اتنا ہی مزے میں ہے۔" لیکن آج کے دور کی بات بالکل برعکس ہے۔ یعنی آج کے دور میں جو جس قدر کم جانتا ہے، اتنا ہی گھاٹے میں ہے چونکہ یہ اکیسویں صدی ہے، جسے 'انفارمیشن ٹکنالوجی' کی صدی کا نام دیا جاتا ہے۔ جو بنیادی طور پر کمپیوٹر کی دین ہے۔ اور جس کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ 'اکیسویں صدی میں کمپیوٹر سے جو لوگ دور رہیں گے، ان کا شمار جاہلوں میں ہوگا۔

محمود ایاز کے اس فکر کی ترجمانی علامہ اقبال کے درج ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے ہر زماں جو اپنے عمل کا حساب

محمود ایاز نے نقش اوّل میں اس دور کے ہندستانی ادبا وشعرا کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ بالخصوص فکر واظہار کی آزادی کے مسئلہ میں۔اور اس کے ضمن میں کئی مفید باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ان میں خود اعتمادی اور بدلتے حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ اور جذبہ بھی ابھارا ہے۔

''آج دنیا تغیرات، ایجادات اور انکشافات کے ایک زبردست تحیر خیز دور سے گذر رہی ہے۔زندگی بے حد پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ان تمام تبدیلیوں اور واقعات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے بھی دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ایک ترقی یافتہ ذہن کی، سائنس، فلسفہ اور دیگر سماجی علوم سے تھوڑی بہت واقفیت لازی ہے۔اس کے بغیر موجودہ دور میں زندگی کو بدلنے کی باتیں تو چھوڑیے، زندگی کی رفتار اور اس کے تقاضوں کو سمجھا تک نہیں جاسکتا۔ آپ جن ذہنی آزادی کے لیے چلاتے ہیں، وہ اگر آپ کو مل بھی گئی تو آپ اپنی جہالت اور ذہنی بے مائیگی کی وجہ سے خود اپنے ہاتھوں اس آزادی کے دشمن بن جائیں گے۔اس دور میں ذہنی آزادی کے استعمال کے لیے اپنے ذہن کے فکر کی تربیت، نشو ونما اور وسعت بے حد ضروری ہے۔اور یہ وسعت و فکر کا عمق کالج کی نصابی کتابوں اور اردو رسائل کی ورق گردانی یا سو پچاس انگریزی ناولوں اور نظموں کے پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سارے فنکار اس سے بھی مستغنی ہیں۔ ذہنی اکتسابات، ریاضت، فکر کی گہرائی اور مطالعہ کی افراط نہ موجودہ نسل کے پیشرووں میں تھی، نہ اس نسل کے لوگوں میں۔ ہمارے اکثر وبیشتر فنکار حضرات زیادہ سے زیادہ نیم خواندہ کہلائے جاسکتے ہیں۔اور جب یہ لوگ حریت فکر اور حیات وکائنات کے مستقبل اور تحفظ کی باتیں کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سمندر کا منہ چڑھا رہا ہو۔''

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تاہم وہ اس مسلمہ حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ یہ ہر کس و نا کس کے بس کا روگ نہیں ہے۔اس کے لیے بلند ہمتی اور حوصلہ مندی چاہیے۔یقیں محکم،عمل پیہم اور عزم و استقلال کا پیکر بننا ہوگا۔ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا سے بے نیاز ہوکر اس بار امانت کی شمع کو فروزاں رکھنا ہوگا، چاہے طوفان جیسا بھی ہو۔اس قبیل کی بہت سی مثالیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ایسی شخصیات کی سعی مشکور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان کی حوصلہ مند کوششوں اور رشک بھری زندگی میں ہمارے لیے سامانِ عبرت اور پند و نصیحت ہے۔اس سے اپنی زندگی میں تحریک پا سکتے ہیں۔

"زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک مخلص رویہ اختیار کرنا خونِ جگر سے اپنے فن کی تزئین کرنا نہ کل آسان نہ تھا، نہ آج آسان ہے۔جن لوگوں میں اس بار امانت کو اٹھانے کی سکت تھی،انھوں نے زبردست آندھیوں میں بھی اپنے چراغوں کی لوئیں اونچی رکھیں۔ترقی پسندی کے کٹر سے کٹر دور میں بھی اختر الایمان،فراق،جذبی،مجید امجد،مختار صدیقی،یوسف ظفر،عزیز احمد،عصمت، قرۃ العین حیدر،بلونت سنگھ،بیدی اور اشک جیسے فنکاروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جسے Conformist کہا جا سکے۔ترقی پسند تحریک نے ان میں سے کئی ایک کو اپنا بھی کہا اور ایک دور میں کئی ایک کو دھتکار بھی دیا۔لیکن ان لوگوں کے سینے میں تخلیق کی جو آگ روشن تھی،وہ ہر حال میں جلتی ہی رہی۔آج کسی تحریک کی مقبولیت میں حصہ دار بننے کی ترغیبات نہیں،سیاسی مصلحتوں پر ادبی معیار کو قربان کردینے کے کم از کم اتنے براہ راست مطالبات نہیں رہے ہیں،لیکن ان سہولتوں۔ سچی لگن رکھنے والوں کے لیے یہ سہولتیں ہیں۔لیکن جو لوگ نمود و نمائش،بیرون ممالک کے دوروں اور فوری عزت و شہرت کے خواہاں ہوتے ہیں،ان کے لیے یہ حالات یقیناً بڑے دشوار ہیں۔اس کے

باوجود نئی نسل تخلیق سے زیادہ ذہنی آزادی اور تشکیک کی باتوں میں مصروف ہے۔آج اگر اوّل درجہ کا ادب نہیں پیدا ہورہا ہے،تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نئی نسل علم سے،مطالعہ سے،اکتسابات سے اور تجربات سے فکرو ذہن کی ریاضت سے جی چرارہی ہے۔''بقول حیرتؔ

سعیِ پیہم نہ ہو تو اے حیرت
ہاتھ لعل و گہر نہیں آتے

محمود ایاز کے ان پاکیزہ خیالات اور بلند افکار پر مزید روشنی ان کے مضمون بعنوان'ادب اور سماجی تصور'سے پڑتی ہے،اور ادب کے تئیں ان کا نقطۂ نظر اور فنی بصیرت اجاگر ہوتی ہے کہ ادب کے ذریعہ اصلاحِ معاشرہ،تربیتِ ذہنی اور اقدارِ عالیہ کا فروغ کس حد تک چاہتے تھے۔ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا قدیم بحث چھیڑ کر آپ نے اس اختلاف کو بے معنی قرار دیا ہے۔بایں طور کہ زندگی اور ادب کا رشتہ،چولی دامن کا رشتہ ہے،اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ادب اور زندگی کے رابطۂ باہم سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ ادب زندگی کے حقائق کا آئینہ دار ہوتو پھر فن اور فن کا بڑے سے بڑا معتقد بھی ادب میں کوئی ایسی مثال پیش نہیں کرسکتا،جو کسی نہ کسی پہلو زندگی سے متعلق نہ ہو۔اور جب یہ ثابت ہوگیا تو ادب برائے ادب،اور ادب برائے زندگی کا اختلاف بھی ختم ہوجاتا ہے۔لیکن اگر ادب کے ذمہ تنقیدِ حیات اور تطہیرِ معاشرہ کے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں،تو یہ جائزہ لازمی ہوجاتا ہے کہ ہماری ادبی پیداوار کس حد تک زندگی کی صالح اور مثبت اقدار کی ترجمان ہے۔

یہاں وہ اس امر کی وضاحت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ زندگی کی صالح اور مثبت اقدار سے ہمارا مفہوم کیا ہے؟۔اور یہ سوال کچھ نیا نہیں ہے۔یہ مسئلہ ہر دور میں سوچنے اور سمجھنے والوں سے فکر کا متقاضی رہا ہے۔انگلستان میں صنعتی انقلاب کے وقت میتھو آرنلڈ نے کہا تھا''ہم دو دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہیں،ایک دنیا جو دم توڑ رہی ہے،اور دوسری دنیا جو ابھر رہی ہے''۔

اس ضمن میں کرناٹک کی ممتاز افسانہ نگار اور نقاد ممتاز شیریں کا یہ بیان محمود ایاز کے مذکورہ نظریہ کی پرزور حمایت کرتا ہے۔انھوں نے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی'کے مسئلے پر بڑے

پتے کی بات جرأت مندانہ انداز میں کہی ہے۔

''جس چیز کے بنانے میں انسانی شعور کو دخل ہو، وہ چیز صرف اپنی خاطر باقی نہیں رہتی۔ اس کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور نکل آتا ہے۔ اس لیے ادب برائے ادب کا فقرہ بہت ہی گمراہ کن ہے۔ ادب زندگی کے لیے ہوتا ہے۔ اور اپنے سماجی پہلو کے بغیر زندگی کا تصور نامکمل ہے۔

سماج افراد کا مجموعہ ہے۔ جب کبھی سماج کی بہتری کا خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے، لامحالہ فرد کی بہتری کا خیال بھی ساتھ ہی ابھرتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ افراد کی حالت گری ہوئی رہے، اور سماج بہتر کہلائے۔ سماج کو بہتر بنانے کی جد و جہد فرد کی آزاد نشو و نما اور ترقی ہی کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ فرد کی آزادی ایک انصاف پرور معاشرہ کی تشکیل کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وجود ہی میں نہیں آسکتی۔''

(بحوالہ نیا دور شمارہ 18، 19، مطبوعہ 1949)

لہٰذا محمود ایاز اپنے زمانے کے حالات کو بھی دو دنیاؤں کے درمیان پاتے ہیں، اس تھوڑے فرق کے ساتھ کہ آرنلڈ جس دنیا کو تازہ دم ابھرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ اس دور میں دم توڑ رہی ہے۔

''یہ بات ہمارے ادیبوں کے سماجی شعور پر منحصر ہے کہ ان کی تخلیقات ابھرتی ہوئی دنیا کی پیامبر ہوں گی یا ایک مٹتے ہوئے شکست خوردہ نظام حیات کی نمائندہ، اور جس حد تک لکھنے والوں کا شعور تربیت یافتہ ہوگا، اسی حد تک ان کی تخلیقات بھی ترقی پسند ہوں گی۔

اقدار کی آویزش اور شکست و ریخت کے اس دور میں اگر لکھنے والوں نے اپنے ہوش و حواس برقرار نہیں رکھے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف یا متاثر ہو جانے دیا تو پھر یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کا ایک اکائی کی صورت میں مطالعہ کر سکیں۔ اور اسی طرح زندگی کے شعور و ادراک کا نقص ان کی تحریرات کا نقص بن جائے گا۔

تاہم وہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ایک فنکار کسی استبدادی اور استحصالی

قوتوں کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔فنکار کا خمیر ہی بغاوت سے بنتا ہے،اور انصاف،مساوات اور آزادی اس کے لیے قوی ترین حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن ان کے درمیان ہی مقصد و منزل ایک ہونے کے باوجود نقطۂ نظر کے اختلاف سے انکار ممکن نہیں۔چونکہ ہر ایک کا اپنا زاویۂ نگاہ ہوتا ہے۔جو دوسروں سے مختلف ہوسکتا ہے۔

ماحصل یہ کہ آج تک سچائی اور حقیقت کی منزل تک پہنچنے کا کوئی قطعی معین راستہ نہیں بن سکا ہے۔زندگی کے جدلیاتی عمل اور تاریخی قوتوں کے بہاؤ کو بھی اس سلسلے میں حرف آخر قرار دینا انسانی ذہن کی غلط فہمی سے کہیں زیادہ خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔اس کی روشنی میں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سچائی اور حقیقت کی تلاش میں نظریات پہلے نہیں،بعد میں آتے ہیں۔لہٰذا جو نقاد یا ادبا کسی شہ پارے کی پرکھ میں حقیقت سے زیادہ اپنے نظریات کے جواز کی تلاش میں رہتے ہیں،اس پر سخت تنقید کیا ہے۔بقول ان کے افراد کی داخلی اور روحانی زندگی اور اس کے اضطراب و کش مکش کے ذکر کو ادب میں رجعت پسندی قرار دینے کی بھی یہی وجہ ہے۔حالانکہ حیات و کائنات کے متعلق بعض ایسے سوالات جو ہر سوچنے اور سمجھنے والے کو اور کہیں نہیں ملتا،مثلاً ہم کہاں سے آئے ہیں؟،کہاں جارہے ہیں؟،زندگی کی غرض و غایت کیا ہے؟،موت کیا ہے؟اور موت کے بعد انسان پر کیا گذرتی ہے؟۔اور ایسی ہی کئی ایک باتیں ہیں جن پر آج تک کوئی فلسفہ روشنی نہیں ڈال سکا ہے۔

مشینی فروغ نے مذہبی تصورات کو متزلزل کر کے جہاں انسان سے اس کے صدیوں پرانے عقائد کو چھین لیا،وہاں وہ ان تصورات اور عقائد کا کوئی بدل نہیں دے سکا۔اس نے انسانوں کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق کردیا ہے۔مشینی ارتقا نے جاہلانہ توہمات کے ساتھ ساتھ ان مذہبی تصورات پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔اس طرح انسانی ذہن جس بے پناہ تشکیک اور روحانی

اضطراب کا شکار ہوا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس ذہنی بے بسی کے علاج
کے لیے برناڈ شا نے کہا تھا کہ ''اگر خدا نہیں بھی ہے، تو ہمیں اپنے وجود کی
خاطر اس کی تخلیق کرنی پڑے گی''۔

اس استدلالی اور فاضلانہ بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کسی نظم یا نثر کے ٹکڑے کو ادبی حیثیت و مقام دینے کے لیے نہ صرف موضوع کی ہمہ گیری ضروری ہے بلکہ اس میں مقصدیت اور اخلاقی اقدار کا عنصر بھی پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن محمود ایاز صرف اسے کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ مذکورہ خصائص کے ساتھ اسلوب کی جدّت و ندرت، طرزِ بیان کی اثر پذیری و دل سوزی بالفاظ دیگر لسانی جمالیاتی عناصر اور فنی لوازمات سے بے نیاز ہو کر نثر و نظم کا کوئی حصہ ادب کے معراج کو نہیں پہنچ سکتا۔

فاضل نقاد نے سوال کھڑا کیا ہے کہ اگر صرف موضوع کی ہمہ گیری اور مواد کی فراہمی کی بنیاد پر نثر و نظم کو ادب تسلیم کر لیا جائے تو انجمنوں اور سیاسی جماعتوں کے منشور اور سیاسی اخباروں کے اداریے بھی فن و ادب کے لازوال شہ پارے کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں انگریزی ادب کے گہرے مطالعے کی روشنی میں دو ناولوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

دو ناول All Quete on the western front اور Farewell to the Arms ہیں جو علی الترتیب امار کے اور ہمینگو سے کی تخلیق ہے۔ ان دونوں ناولوں کو اس بات کے استدلال میں پیش کیا ہے کہ موضوع کی ہمہ گیر اپیل اور اہمیت کے باوجود دونوں ناول ادبی حیثیت حاصل نہ کر سکے۔ اس کے برخلاف فیلڈنگ کے ناول Uncle tom's Cabin کا جو اول الذکر ناولوں سے برسوں پیشتر لکھا گیا تھا، ناول نگاری میں اہم مقام رکھتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی چیز آرٹ اور صحافت کا وہ بنیادی فرق ہے، جو ان میں موجود ہے۔ حالانکہ دونوں کے درمیان بہت سی باتوں میں اشتراک و یکسانیت ہے، (جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)، پھر بھی دونوں ایک سا درجہ حاصل نہیں کر سکے۔

یہاں فاضل نقاد کے نزدیک اس کی سب سے بڑی خصوصیت مصنف کا خلوص ہے، اس تقابلی مطالعہ کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اردو کے بہت سے ترقی پسند ادیبوں میں کچھ ہو

تو ہو، لیکن خلوص نہیں ہے۔ اور خلوص کا یہی فقدان ترقی پسند تحریروں کی بے رنگی، ادبی تنوع کے انحطاط اور ادب میں فنی اور جمالیاتی عناصر کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہورہا ہے۔

لہٰذا محمود ایاز کا ترقی پسند ادبا سے اظہار ناراضگی اور ان پر طنز کے نشتر چبھوتا ان کا یہ تبصرہ لائق توجہ ہے کہ موضوع خود اپنا ذریعہ اظہار متعین کرتا ہے۔ لیکن جس چیز کو دوسروں کے لیے متاثر کن بنانا مقصود ہو، وہ اگر خود کوئی تاثر نہ چھوڑ سکے، اور قلم کار جس موضوع کو اپنی تخلیق کا موضوع بنانا چاہتا ہے، اگر اسے خود اپنے وجدان کی گہرائیوں میں محسوس نہیں کیا ہے، تو پھر یہ توقع فضول ہے کہ آپ صرف نظریاتی اعتبار سے کسی حسینہ کے حسن و تاثر کے قائل ہو کر ایک متاثر کن ادبی تخلیق کو وجود میں لاسکیں۔

اس کی مثال میں فسادات پر لکھے گئے افسانوں کو پیش کیا ہے۔ جس میں عظیم ادب کا موضوع بننے کی صلاحیت ہونے کے باوجود اردو لکھنے والے اس عظیم سانحہ کا ادبی تخلیق میں اظہار نہ کرسکے۔ اس طرح وہ ادب کے شاہکار بننے سے محروم رہ گئے۔ سوائے دو چند ناول کے جن میں نا خدا، اور انسان مرگیا وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں کمی یہی رہی کہ فسادات پر سینکڑوں افسانے لکھے گئے مگر ان میں تاثیر کی لذت، خلوص کی گہرائی، اور جذبات کا موثر اظہار نہ ہونے کی وجہ سے اور فنی لوازمات سے بے نیازی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ اس ناکامی کی دو بنیادی وجہ بتاتے ہیں۔ ایک یہ کہ فسادات کی تفصیلات پر افسانوں کی بنیاد رکھی گئی۔ دوم یہ کہ فسادات کی ہولناکی کا ہلکا سا عکس بھی ان کے تجربے سے نہیں گزرا۔ جس کی بنیاد پر موضوع ایک حقیقت ہونے کے باوجود افسانوی رنگ اختیار کر گیا۔ دوسری طرف تفریط یہ کہ جنھوں نے اپنے اعصاب اور دل و دماغ پر حادثہ کی جذباتیت کو محسوس کیا، اور خلوص سے لکھے مگر فنی مصروفیت عنقا ہونے کے سبب وہ بھی ادب بننے سے رہ گیا۔

روزنامہ سالار کا آغاز

محمود ایاز بحیثیت مدیر و نقاد اور تبصرہ نگار ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں سوغات کے ذریعہ پہلے ہی متعارف ہو چکے تھے۔ لیکن روزنامہ اخبار کے ایک باوقار مدیر کی حیثیت سے 1963 میں متعارف ہوئے۔ جیسا کہ ان کی افتاد طبع تھی کہ کوئی بھی کام پوری دل جمعی اور محنت کے ساتھ

ہو تو کرنا چاہیے، ورنہ اس کام کا نہیں کرنا ہی بہتر ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کام کے تعلق سے محمود ایاز کی یہ افتادِ طبع صدر محترم ڈاکٹر ذاکر حسین کے فکر و خیال سے بالکل ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ صدر محترم نے اپنے ایک خطبہ میں کام کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں ہے۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے۔ بامقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ اور اس میں جو پورا اترتا ہے، تو وہ خوشی دیتا ہے، جو اور کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔ (بحوالہ مضمون بعنوان 'جینے کا سلیقہ' بقلم غلام السیدین)

محمود ایاز کام کے موجودہ صورت حال اور معیار کا جائزہ لیتے پھر اس سے بلند تر ہو کر جدت و ندرت کا ایسا نمونہ پیش کرتے جو معاصر کے لیے اس کی تقلید مجبوری بن جاتی۔ اسی عزم و ارادے کے ساتھ میدان صحافت میں آئے۔ موجودہ اردو صحافت کا جائزہ لیا۔ محمود ایاز کے معتمد رفیق کار علی حفیظ جو چیف رپورٹر کی حیثیت سے سالار میں خدمات انجام دے چکے ہیں، انھوں نے اس دور کے اردو صحافت اور معیار کے متعلق لکھا ہے کہ ان دنوں بنگلور میں اردو اخبار صبح 11 / بجے شائع ہوتا تھا۔ اخبار کا سائز چھوٹا تھا۔ اندرونی صفحات ایک دن قبل ہی چھاپ کر رکھ لیے جاتے۔ صبح بازار سے انگریزی اخبار دکن ہیرالڈ حاصل کیا جاتا، اس اخبار میں شائع خبروں کا ترجمہ صفحۂ اول اور آخر میں شائع ہوتا۔

محمود ایاز نے اس رسمی صحافت سے بلند تر ہو کر معیاری صحافت پیش کرنے کا عزم کیا۔ انھوں نے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اردو والوں کو اردو اخبار فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اخبار کا نام 'رفتار' تجویز ہوا، لیکن اس نام سے ڈکلیریشن نہیں ملا جس کے بعد 'سالار' طے ہوا۔ کیولی روڈ میں جماعت خانے کی بلڈنگ میں جگہ کا بندوبست ہوا۔ ممبئی سے پرنٹنگ مشین لائی گئی انگریزی خبر رساں ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا سے خبریں خریدیں۔ اخبار کا سائز بڑھایا۔ اس طرح سالار کی آمد میدان صحافت میں ایک انقلاب کی نوید مسرت تھا۔ جوش و امنگ سے سرشار معتمد رفقا صحافی رات دیر تک کام کرتے۔ ان تمام کوششوں کے نتیجے میں 1964 سے روز نامہ سالار جنوب کے آسمان صحافت پر ایک نئے ستارہ کے طور پر نمودار ہوا، جو تا حال سرگرمِ عمل

ہے۔غرض ان کے اس عزم کی ترجمانی علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

اولوالعزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

اس بات کی تصدیق شفیع احمد شریف (مرحوم) ایڈیٹر آفتاب کرناٹک میسور کے اس محاضرہ سے بھی ہوتی ہے، جوانھوں نے بتاریخ 4/جون 2002 کو دارالامور، گنجام، سری رنگاپٹن میں 'اردو صحافت کے مسائل' کے عنوان سے دیا تھا۔مرحوم نے اردو صحافت کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ زمانہ ماضی میں اردو اخبارات کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔کرناٹک میں اردو صحافت کی دیا ٹمٹما رہی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب یہ دیا اپنی تاب کھو دے گی اور یہاں سے اردو صحافت کا چراغ گل ہو جائے گا۔اسی اثنا میں محمود ایاز نامی شخصیت نمودار ہوئی اور صحافتی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔اردو میڈیا کی دنیا میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔اسی طرح کے خیالات کا اظہار میر بدرالدین (مرحوم) سابق ایڈیٹر روزنامہ سالار، نے بھی کیا تھا جب وہ طلبۂ دارالامور سے صحافت کے موضوع پر محاضرہ دے رہے تھے۔2002ء میں وہ بھی دارلامور ٹیپو سلطان اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی مرکز کو تشریف لائے تھے اور صحافت کے موضوع پر محاضرہ دیا تھا۔راقم اس وقت دارالامور میں زیر تعلیم تھا۔

سالار مجموعی طور پر کرناٹک کے مسلمانوں کا ترجمان، ان کے حقوق کا پاسبان اور ایوان حکومت میں ان کی صدائے بازگشت بن کر ابھر رہا تھا۔اخبار کو یہ مقام و مرتبہ دلانے میں محمود ایاز کو اگرچہ دن رات ایک کرنے پڑے لیکن 'ہمتِ مرداں مددِ خدا' کے تحت عزم و ارادے پر اٹل رہے۔شائستہ یوسف سالار کو ابتدائی دنوں میں درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اس زمانے میں جب سالار شروع کیا، محمود ایاز نے بڑی دقتیں اٹھائیں، ممبئی جاکر پریس کے لیے مشین خرید کر لائے۔سالار شروع تو ہو گیا لیکن ہزاروں مشکلیں آئیں۔ایک دن اخبار نکلتا، دوسرے دن اخبار کے لیے پیسے اکٹھا کرنا مشکل ہو جاتا۔خود بھی نیوز کے لیے بھاگتے، راتیں جاگ کر کاٹتے، ترجمے خود کرتے، محنت کر کے سچے واقعات کو اپنے اخبار

میں جگہ دیتے۔ اس محنت اور دیانت داری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے
لیے اپنی آواز اٹھانے کی کوئی سبیل نظر آئی۔"

مسائل و مشکلات سے گذر کر سالار نے جو انفرادیت قائم کی اور امتیاز پیدا کیا، علی حفیظ کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

"آزادیٔ وطن کے بعد ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح کرناٹک کے مسلمان بھی ایک طرح سے مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ آزادی کے وقت سرکاری ملازمتوں میں ملازمت کا تناسب 14 / 12 فی صد تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد گھٹنے لگی۔ نہ صرف سرکاری ملازمتوں بلکہ تعلیمی اداروں میں بھی مسلمانوں کے داخلے بند ہونے لگے تھے۔ اردو زبان کا حق مارا جا رہا تھا۔ باقاعدہ طور پر مسلمانوں کی ترقی روکنے کے لیے انھیں مختلف مسائل میں الجھایا جانے لگا۔ عام طور پر مسلمان مایوس تھے۔
ایسے مایوس کن اور حوصلہ شکن حالات میں سالار واقعی سالارِ ملت ثابت ہوا۔ مسلمانوں کو مایوسی کے دلدل سے نکالنے کی مختلف سعی کی۔ ان میں خود اعتمادی، حوصلہ مندی اور ہمت و جرأت بحال کیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ حکومتِ وقت کے مصاحب بنے ہوئے چند ایک مسلمان 'سب کچھ ٹھیک ہے' کا راگ الاپتے رہے۔ چنانچہ محمود ایاز نے اس طرح کے مسلمانوں کے لیے، جو مسلمانوں کے مفادات کو پس پشت ڈال کر حکومتِ وقت کی چاپلوسی کیا کرتے تھے 'سرکاری مسلمان' کی اصطلاح وضع کی۔ یہ اصطلاح اردو صحافت میں یقیناً ایک اضافہ تھا، جس کے ایجاد کا سہرا محمود ایاز کے سر جاتا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ سالار کے ذریعہ محمود ایاز نے مسلمانوں کے عام مسائل اٹھائے، انھیں اپنی ترجیحات از سرِ نو طے کرنے کا مشورہ دیا، ان میں خود اعتمادی کے جذبہ کو بیدار کیا۔ انھیں اپنے مسائل حل کرنے کے لیے خود کوشش کرنے اور مسلسل جد و جہد کرنے کا مشورہ دیا۔ جب سرکاری ایوانوں میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ محمود ایاز کی کوششوں سے روزنامہ سالار مسلمانوں کے دلوں کی

دھڑکن اور ان کے جذبات واحساسات کا ترجمان بنتا جارہا ہے،تو ستمبر 1965 میں ہند پاک جنگ شروع ہوئی،اور حکومت نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے محمود ایاز کو حراست میں لیا۔یکے بعد دیگرے روزنامہ وہفت روزہ اخبارات کے تمام مدیران کو قید کرلیا گیا۔ان میں جناب عزیز سیٹھ،مولانا محمد سراج الحسن،مولانا سید جمال احمد امین آبادی،جناب عثمان اسد(مدیر ہفت روزہ 'نشیمن')جناب محمد عبدالہادی رفعت(مدیر روزنامہ آزاد)جناب محمد اسماعیل تابش(مدیر روزنامہ پاسبان)جناب رشید خاں(مدیر ہفت روزہ تشہیر) کے نام بطور خاص آتے ہیں۔

اتنے سارے افراد کی گرفتاری ہوئی لیکن کہیں سے بھی کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔گویا پوری قوم کوسانپ سونگھ گیا تھا۔محمود مسلمانوں کے اس بزدلانہ رویے اور سرد مہری سے سخت نالاں ہوئے۔اس خفگی کا اظہار انھوں نے قید خانہ سے درج ذیل غزل کے ذریعہ کیا جس کا ہر شعر خاموش تماشائیوں کے دل پر نشتر کا کام کیا۔

زنداں نامہ'

اک تیغ خوں چنیدہ سروں پر سبھی کے — لیکن یہ سحر ہے کہ کوئی دیکھتا نہیں
اک حرف شوق دل میں سبھی کے تپاں ہے اب — وہ مہر ہے لبوں پہ کوئی بولتا نہیں
کیا پتھروں میں ڈھل گئے یاران قافلہ — رہزن کو تک رہے ہیں،کوئی بولتا نہیں
اب ترک آرزو سے بھی بنتی نہیں ہے بات — اہل ہوس کو اس کا ابھی تک پتہ نہیں
اے کشتگان بے کسی چند روز اور — وہ انقلاب نوجوان ابھی تک ہوا نہیں

مذکورہ غزل کا درج ذیل شعر خوب پسند کیا گیا۔

کیا پتھروں میں ڈھل گئے یارانِ قافلہ
رہزن کو تک رہے ہیں،کوئی بولتا نہیں

سالار چونکہ رسمی صحافت کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی منفرد پہچان بنا رہا تھا،اور ایک انقلابی راہ پر گامزن تھا،اس لیے اس کا رول مشن اور تحریک کی حیثیت رکھتا تھا۔1966 میں آل انڈیا مجلس مشاورت کے سرکردہ رہنما اور ریاستی قائدین پر مشتمل ایک وفد نے پوری ریاست میسور کا دورہ کیا ،اس دورے کا آغاز کولار میں منعقد ایک تاریخی اجلاس سے ہوا،جس میں کئی مقتدر شخصیات نے

حصہ لیا تھا۔ محمود ایاز نے اس اجلاس کی رپورٹ بذریعہ فون ایک بجے رات میں سالار کو دی۔ نیز قومی و ریاستی رہنماؤں کے ساتھ پوری ریاست کا دورہ کیا اور خبریں سالار میں شائع ہوتی رہیں۔ اجلاس کے انعقاد سے قبل بھی مجلس کے اغراض و مقاصد پر مشتمل سلسلہ وار مضامین شائع کر کے مجلس کی بھرپور حمایت کی۔ مجلس کے جن قومی رہنماؤں نے ریاست میسور کا دورہ کیا تھا، ان میں ڈاکٹر سید محمود، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مفتی عتیق الرحمن، مولانا منظور احمد نعمانیؒ، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، کے نام لیے جاتے ہیں، جبکہ ریاستی عمائدین میں جناب یم این انور، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب مظہر امام (سابق رکن پارلیمنٹ) ملا جان محمد، جناب عزیز سیٹھ، مولانا محمد سراج الحسن اور محمود ایاز کے نام آتے ہیں۔ (بحوالہ مضمون علی حفیظ)

محمود ایاز نہایت دیانت دار بے باک اور صاف گو صحافی تھے۔ زبان پر دسترس حاصل تھا۔ بطور خاص الفاظ کے برمحل استعمال پر ملکہ حاصل تھا۔ الفاظ کے معمولی ہیر پھیر سے معنوی مراد پوری کر لیتے۔ الفاظ اور اس کے معنوی تاثیر کا خاص خیال رکھتے۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے علی حفیظ سے اس بات کی نصیحت کی کہ ''الفاظ بے جان پتھر نہیں ہوا کرتے۔ الفاظ کا مناسب استعمال کرنا چاہیے، ورنہ یہی الفاظ تمھیں سر بازار رسوا کر دیں گے''۔ آب زر سے لکھے جانے کے قابل یہ نصیحت آج بھی صحافی برادری کے لیے نسخہ کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایاز صاحب ایک ذمہ دار اور پابند وقت مدیر واقع ہوئے تھے۔ سالار ان کی فکری غذا اور لازمۂ زندگی بن گیا تھا۔ صحافت کا جنون ان پر ایسا سوار ہوا کہ ان کے فکر سخن اور ذوق شاعری پر غالب آنے لگا اور عوام و خواص میں ان کی شناخت بحیثیت شاعر ماند پڑ گئی۔ ان سے واقف کار بتاتے ہیں کہ وہ روزانہ صبح 9 بجے دفتر پہنچ جاتے، اخبار شروع سے آخر تک پڑھ لیتے، جہاں کہیں غلطیاں نظر آئیں، انھیں کاٹ دیتے۔ ان کی جگہ صحیح اور مناسب الفاظ لکھ دیتے، کہیں کہیں مشورے بھی ہوتے۔ ڈاک میں اشاعت کے لیے آئے ہوئے شعری و نثری تخلیقات، مضامین و مراسلات ایڈٹ کرتے۔ اس طرح وہ اپنی ادارتی ذمہ داری نبھاتے۔ پابندیٔ وقت ان کی زندگی کا وہ عنصر ہے جس میں نئی نسل کے لیے سبق ہے اور ضرب المثل کی حیثیت و اہمیت رکھتا ہے۔ شائستہ یوسف، حلیمہ فردوس (زوجہ ملنسار اطہر) کے حوالے سے ان کی پابندیٔ وقت کا واقعہ بیان

کرتی ہیں کہ ملنسار اطہر ریڈیو میں ریکارڈنگ کا وقت دے چکے ہوتے تھے۔ جو وقت ریکارڈنگ کے لیے دیا جاتا تھا، گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ایاز صاحب اسٹوڈیو میں حاضر رہتے تھے۔ بہر حال محمود ایاز نے روزنامہ سالار کسی سبب سے ستر کی دہائی کے اخیر میں کے رحمان خان (موجودہ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور) کے ہاتھوں فروخت کردیا۔ لیکن اخبار کو اپنی نظر میں عزیز رکھا۔

دیگر علمی وادبی خدمات

مجلس ادب بنگلور، جس کا قیام 15 راگست 1949 کو عمل میں آیا، کے ذکر خیر میں محمود ایاز کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محمود ایاز کا نام ادارہ کے بانیان کی فہرست میں نظر نہیں آتا لیکن بعد میں ان کی شمولیت اور ادارہ سے ان کی وابستگی، ادب کی شمع فروزاں کی مدھم ہوتی لو کو نیا حوصلہ اور امنگ دینے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس بات کا اعتراف مجلس ادب کے زیر اہتمام شائع ہونے والے 'جنوبی ہند کا بہترین ادب' کے ایک تعارفی مضمون، بعنوان 'زشررستارہ سازیم' میں کیا گیا ہے۔

> ''مجلس ادب کے مینارۂ نور کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں اور ضیا پاشیاں جاری ہوگئیں۔ ہمارا ساتھی ہمارے ساتھ اس کی چوٹی پر کھڑا اپنی سنجیدہ، غم آشنا اور پرسوز آواز میں تمام محبان اردو کو دعوت اشتراک دے رہا تھا۔ اور ہر لحظہ نئے انداز سے ہماری حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ یہ آواز دور دور تک پہنچی اور بڑی موثر ثابت ہوئی۔ اور ہمارا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ لیکن اس مینارۂ نور کی کرنیں ابھی مدھم تھیں، خوف تھا کہ کہیں یہ مدھم کرنیں فضا کی تاریکی میں تحلیل ہوکر نہ رہ جائیں کہ محمود ایاز جیسا بیدار مغز نوجوان اور عظیم شاعر اور میر ضیاء اللہ جیسا سنجیدہ ادیب ونقاد ایک نئی توانائی اور ایک بے پناہ جوش لیے ہماری بزم میں آپہنچے۔ مدھم کرنیں بجلی کی لہریں بن گئیں۔ یہ یقیناً مجلس ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو بیک وقت اتنے اچھے ساتھیوں کا اشتراک حاصل ہے۔''

یہاں اس ادارہ کے قیام کا پس منظر، اغراض ومقاصد اور بانیوں کا مختصر ذکر اس طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے نہ صرف اس بزم اردو کے وجود میں آنے کی شدید ضرورت کے احساس کا علم

ہوگا بلکہ خاص حالات کے تناظر میں اس کے کارہائے نمایاں کی اہمیت وافادیت سے بھی روشناسی ہوگی۔اس سلسلے میں ذیل کا اقتباس ان باتوں پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

''حصولِ آزادی کے بعد کی انسانیت سوز اور ننگ آدمیت حرکات نے اشرف المخلوقات کی جبینِ مقدس کو درندگی کی چوکھٹ پر جھکا دیا تھا۔ ہر حساس شخص یہ دیکھ کر نہایت ہی مایوس ہوا تھا کہ انسان انسان کے ساتھ کیا کررہا ہے۔ بقول ورڈزورتھ ''ہم سب انسان کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں۔

ظلم وتشدد کے بوجھ تلے دبی ہوئی انسانیت اپنے مستقبل کی رہبری کے لیے انسان ہی کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔تہذیب وتمدن کے عالی شان قصر دیکھتے ہی دیکھتے منہدم ہوکر کھنڈرات میں تبدیل ہورہے تھے۔اس بہیمیت کے مظاہرے نے ہماری روایات اور ہمارے اعتقادات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہمارے ذہنی افکار منتشر ہوگئے اور تخلیق کے سرچشمے خشک نظر آنے لگے۔ان ہندوستان گیر حالات کے علاوہ چند عالمگیر مسائل بھی انسان کے ذہن وفکر کو پریشان کیے ہوئے تھے۔صنعتی دور نے انسانی زندگی کے لائحۂ عمل کو بڑی سرعت کے ساتھ تبدیل کردیا۔سائنسی معلومات و جدید انکشافات نے جہاں چند سہولتیں مہیا کردیں،وہاں کئی پیچیدہ مسائل پیدا کردیے۔زمانے کے ہر حساس شخص اور گروہ کی طرح ہم بھی ان تبدیلیوں کو محسوس کررہے تھے۔ بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان اور زندگی کا واحد حل ہے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

..........غرض آزادی کے بعد ہر محبِّ اردو کو اردو زبان کی بقا اور ترقی کا مسئلہ بہت پریشان کرنے لگا۔انہیں احساسات کا ردعمل مجلس ادب کی قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔اور ہم گذشتہ آٹھ سال سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنی بساط بھر کوشش کرتے آئے

ہیں۔ ہماری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ مجلس ادب بنگلور کے مینارۂ نور سے اردو کے کوندے پھوٹ پھوٹ کر زندگی کی راہوں کو منور کرتے رہیں۔

مجلس ادب بنگلور کی بنیاد جن مخلص و بے لوث فدایان علم و ادب کے ہاتھوں پڑی ان میں م۔ اسماعیل، مجاہد علی پوری، حسین شاہین، مظہر امید، راؤ آنند، سید عبدالحفیظ، عبدالغفور، غفار حسینی، سید ضیاء اللہ بی اے، عبدالہادی رفعت، محمود شریف اور علی نواز کے اسماء گرامی خاص الخاص ذکر اور دلی تشکر اور ممنونیت کے مستحق ہیں۔

چنانچہ ایک عظیم مقصد کے تحت قائم کیے گئے مجلس ادب اور اس کے مخلص کارکنان میں محمود ایاز کی شرکت وقت کا عین تقاضا تھا۔ چونکہ اس کی نسبت اردو زبان و ادب سے تھی، جس کے لیے وہ خود کو وقف کر چکے تھے۔

اردو اکیڈمی کی چیرمین شپ

کرناٹک اردو اکادمی کے چیرمین کی حیثیت سے محمود ایاز نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ اکیڈمی کی تاریخ کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ یہ اردو اکیڈمی کی خوش بختی کہیے کہ دو میعاد کے لیے محمود ایاز کی چیرمین شپ میں رہی۔ 1983 پھر 1991 میں دوسری میعاد کے لیے محمود ایاز اکیڈمی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ اکیڈمی نے ان کی چیر مین شپ میں بجز دیگر کاموں کے دو اہم کام انجام دیے، جو اپنی نوعیت کے منفرد کام تھے، جس کا سہرا اکیڈمی کے سر جاتا ہے۔ اول اردو۔ کنڑ لغت اور کنڑ۔ اردو لغت کی تدوین و ترتیب اور اس کی اشاعت، اور دوسرا اہم کام ریاست کی مختلف لائبریریوں کو اردو کتابوں کی فراہمی۔ علاوہ ازیں ن۔ م راشد اور عزیز احمد پر سمینار کروائے اور مقالہ جات شائع کیے۔ جس کے لیے بعض گوشوں سے ان پر اعتراض ہوا۔ لیکن چونکہ ان کو اردو زبان اور محبان اردو سے لگاؤ تھا۔ اس اعتراض کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ان کے استغنیٰ اور بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ راج اتسوا ایوارڈ برائے سال 1989 لینے خود نہیں گئے بلکہ محکمہ کنڑ اور کلچر نے خود ان کی رہائش گاہ پر پہنچایا۔ ماریشش میں منعقد اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت تک کو ٹھکرا دی۔

اس کے علاوہ محمود ایاز بنگلور کلب اور ٹرف کلب کے ممبر بھی تھے۔ ان کا حلقۂ دوست واحباب بہت وسیع نہ تھا۔ چونکہ احباب کے انتخاب میں بھی ان کے خاص معیار، ذوق اور فکر و نظر کو

دخل تھا۔ان کی ادبی خدمات کے سبب حلقہ تعارف تو وسیع تھا،لیکن حلقہ احباب محدود تھا،جن کو ان کے احباب خاص اور یاران با اختصاص کہنا زیادہ درست ہوگا۔اور جو ان کے ہم نشیں، ہمدم اور محرم راز کہے جا سکتے ہیں،ان میں خلیل مامون اور عزیز اللہ بیگ بطور خاص آتے ہیں۔یہ دونوں ان کے دست و راست بن کر تھے۔ضیا میر،راز امتیاز،سلیمان اریب،مجیب شریف،محمود شریف،پہلے زمرہ میں آتے ہیں،جبکہ باقر مہدی،اختر الایمان،ساجدہ زیدی،سجاد ظہیر،،آل احمد سرور،مغنی تبسم ،نجم الثاقب شحنہ،فضیل جعفری،خلیل الرحمٰن اعظمی،شہر یار،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،راجندر سنگھ بیدی،نیر مسعود،عرفان صدیقی اور صفیہ اریب وغیرہ سے گہرے ادبی مراسم و ملاقات و مراسلت رہی ہے۔

محمود ایاز 1997 میں کینسر جیسے موذی مرض سے دوچار ہوئے،انھیں ملیا اسپتال میں داخل کیا گیا،پھر وہاں سے منی پال اسپتال منتقل کیا گیا لیکن تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے اور وہیں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔اس طرح اردو دنیا کی یہ عظیم شخصیت ،اپنی خدمات کے انمٹ نقوش چھوڑ کر سفر آخرت کو چل بسی۔پسماندگان میں بیوی مریم ایاز اور فرزندان جواد ایاز احمد و وصی ایاز احمد ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے؟

محمود ایاز......اختر الایمان

''اختر الایمان اب اردو کے بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم اور قبول کیے جا چکے ہیں۔فیض سے قطع نظر کریں تو اردو کے جدید شاعروں میں شاید ہی کسی اور شاعر کو صرف شاعری کی بنیاد پر اختر الایمان سے زیادہ داد و تحسین ملی ہو۔اختر الایمان بجا طور پر اس کے مستحق ہیں۔اور برسوں ان کی شاعری سے جو بے اعتنائی برتی گئی تھی،اس کی تلافی ضروری بھی تھی۔لیکن ہم لوگ افراط و تفریط سے بچ نہیں سکتے۔اگر ایک عرصے تک اختر الایمان کی شاعری کو انظر انداز کیا جاتا رہا،تو اب کوئی یہ کہنے والا نظر نہیں آتا کہ اختر الایمان آج کل بہت کمزور شاعری کرنے لگے ہیں۔'

شاید یہ بات عجب سی معلوم ہو کہ جس شاعر کے لیے رسالے میں خراج عقیدت

کے طور پر ایک گوشہ مخصوص کیا جائے، اسی رسالے میں اس کی شاعری کو کمزور بھی کہا جائے۔ لیکن یہ گوشہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جدید اردو شاعری میں اختر الایمان کی بڑائی اور اہمیت ناقابل انکار ہے۔ شکایت ان کی موجودہ شاعری اور ان کے موجودہ رجحان سے ہے۔ اختر الایمان میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ اور اس وجہ سے بھی مجھے ان کی کمزور شاعری سے دکھ ہوتا ہے۔ زیادہ دکھ اس بات کا بھی ہوتا ہے کہ وہ دیباچوں میں اس کا دفاع بھی کرتے رہتے ہیں گو دفاع سمجھ کر نہیں۔'' (سوغات، شمارہ ماہ ستمبر 1991)

محمود ایاز کی اس تحریر میں دو متضاد باتیں ملتی ہیں۔ ایک طرف انھیں فیض سے قطع نظر جدید شعرا کی فہرست میں قد آور شاعر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اور اس تسلیم و رضا کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ بطور خاص اس تناظر میں کہ برسوں ان کی شاعری کے ساتھ بے اعتنائی برتی گئی۔ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف خود صاحب تحریر نے اس طور پر کیا ہے کہ اپنے ادبی رسالہ 'سوغات' شمارہ ستمبر 1991 میں بطور خراج عقیدت ایک گوشہ مختص کیا، اس کے ساتھ ہی ان کے فن میں ایک گنا نقص محسوس کرتے ہوئے برملا اس کا اظہار کیا ہے۔ خاص طور سے ان کا یہ جملہ کہ'

'شکایت ان کی موجودہ شاعری اور ان کے موجودہ رجحان سے ہے۔ اختر الایمان میرے پسندیدہ شاعر ہیں اس لیے اس وجہ سے بھی مجھے ان کی کمزوری سے دکھ ہوتا ہے۔ اور زیادہ دکھ اس بات کا بھی ہوتا ہے کہ وہ دیباچوں میں اس کا دفاع بھی کرتے ہیں، گو دفاع سمجھ کر نہیں'۔

محمود ایاز نے جہاں شخصیت کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے وہیں فن پر ناقدانہ تبصرہ بھی کیا ہے، جو ایک باذوق، منصف مزاج اور بالغ نظر ناقد و مبصر کا ہی حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ عموماً ادبی شہ پاروں کی جانچ پرکھ میں پیشہ ور ناقدین تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کی قلابیں ملا دیتے ہیں، اور اگر بادل نخواستہ نثر یا نظم موصوف مبصر کے مزاج کے خلاف گیا تو پھر انھیں کہیں کا نہیں چھوڑا جاتا۔ محمود ایاز نے یہاں جو اعتدال، توازن اور انصاف پسندی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ واقعی ایک منصف مزاج مبصر کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

اس سے قطع نظر محمود ایاز کے اس اقتباس کو اختر الایمان کے ساتھ ان کی ہوئی بات چیت بعنوان 'ایک مکالمہ......اختر الایمان۔ محمود ایاز' کا پس منظر کہا جا سکتا ہے، اور اس انٹرویو کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اس مکالمہ کا ادبی دنیا میں کافی چرچا رہا ہے۔ مکالمہ بظاہر بے لاگ اور برجستہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اختر الایمان کو محمود ایاز اچھی طرح پڑھ چکے تھے، ان کی ادبی نگارشات و منظوم کلام کا گہرائی سے مطالعہ کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ ترقی پسند شعرا کی فہرست میں انھیں پسندیدہ شاعر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں جہاں تنقید کی گنجائش نظر آئی، اس کے اظہار میں تامل سے کام نہیں لیا۔

مکالمہ کے ذریعے بالآخر اختر الایمان سے وہ بات کہلوائی، جو وہ ان کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔ اور اس فنی نقص کا اظہار کیا جس پر انھیں دکھ تھا۔ مکالمہ بہت طویل ہے، اور یہ سوغات کے بارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔۔ لہٰذا سارے مکالمہ کو من و عن یہاں جگہ دینا موجب طوالت ہوگا۔ اس لیے اس سے اجتناب کرتے ہوئے اہم استفسارات پیش خدمت ہیں۔

اس انٹرویو کا جسے پیش خیمہ کہنا چاہیے وہ اختر الایمان کا درج ذیل بیان ہے جو انھوں نے کراچی میں ایک انٹرویو کے دوران دیا تھا۔

> ''ترقی پسند احباب کی شاعری کلام موزوں (Versification) سے آگے نہیں جاتی۔ باستثنائے مجاز، فیض، مخدوم اور فراق کے، سب کی شاعری انھیں تخلیقی شاعری سے باہر کی چیز نظر آئی۔ انھوں نے دو نمائندہ ترقی پسند شاعروں کے نام لے کر کہا سردار جعفری شاعر نہیں، موزوں طبع ہیں۔ اور کیفی اعظمی کے بارے میں کہا 'شاعری کے معاملے میں انھیں Genuine شاعر نہیں سمجھتا۔ ان کے یہاں Versification کے سوا کچھ بھی نہیں''............بحوالہ: کتاب نما شمارہ مارچ 1991)

مکالمہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''ابھی پچھلے دنوں ایک انٹرویو میں اردو کے ایک شاعر کے بارے میں آپ

نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ جو ہیں، دراصل شاعر نہیں، بلکہ ورسیفائر ہیں، کلام منظوم
کے شاعر ہیں۔ جن لوگوں کے بارے میں آپ نے یہ بات کہی ہے، وہ صحیح ہے
یا غلط، اس سے قطع نظر مجھے بات کی بنیادی نوعت سے سروکار ہے۔ اگر آپ
مناسب سمجھیں تو تھوڑی سی وضاحت ہوجائے کہ کلام منظوم اور ورسیفیکیشن
سے آپ کی مراد کیا ہے۔"

اس کے جواب میں اختر الایمان صاحب نے آمد اور آورد کی بحث چھیڑی ہے۔ جو پورے مکالمہ میں زیر بحث ہے۔ اور اسے کلام کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا میزان قرار دیا ہے۔ بقول اختر الایمان جس کام کے کرنے میں بیرونی دباؤ شامل نہ ہو اور اندرونی صلاحیت اور بصیرت کام کرتی ہو، وہ آمد ہے اور برجستہ کلام ہے۔ اور جس کو سوچ سمجھ کر اور مضمون بنا کر کہیں، وہ آورد کہلاتا ہے۔

اختر الایمان نے جب کلام کا معیار پرکھنے کا یہ پیمانہ طے کر دیا تو محمود ایاز نے اگلے سوال میں بڑے پتے کی بات پوچھی کہ آخر اس بات کا پتہ کیسے چلے گا کہ جو نظم آپ کے پیش نظر ہے، وہ بیرونی تقاضے کے تحت لکھی گئی ہے، یا اندرونی تقاضے کے تحت۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس کا کوئی بنا بنایا فارمولا نہیں ہے۔ البتہ جس کے اندر شعری بصیرت ہوگی، وہ اس فرق کو محسوس کرے گا۔

مکالمہ اس کے ساتھ ہی بتدریج طول پکڑتا ہے۔ لیکن اپنے محور پر برقرار رہتا ہے۔ محمود ایاز غزل کی شاعری میں اختر الایمان کے 'آمد و آورد' کے پیمانہ کو غزل کی حد تک تسلیم کیا ہے۔ لیکن نظم کے معاملے میں غیر موزوں بتایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نظم دو چار مصرعوں میں بات کرنے والی صنف نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت میں فردوسی کے شاہنامہ کی مثال دی ہے کہ اتنے ہزار اشعار کی مثنوی میں کتنے اشعار ایسے ہیں، جہاں آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ 'از دل خیزد بر دل ریزد' دل سے بات نکل رہی ہے اور دل پر اثر کر رہی ہے۔ حاصل یہ کہ یہاں آپ کا مقرر کردہ آمد و آورد کا معیار کام نہیں کرے گا۔

محمود ایاز اپنی بات کو مزید ٹھوس ثابت کرنے کے لیے لکھتے ہیں کہ بات دراصل یہ ہے کہ جہاں آپ کوئی ایک موضوع رکھیں گے، اور موضوع ہر منطقی ربط، تسلسل کے ساتھ ایک خاص تناظر میں رکھ کر بات کریں گے، تو جس طرح زندگی کا ہر لمحہ پر مسرت نہیں ہوتا، ہر لمحہ نشاط یا کرب کا نہیں ہوتا، مختلف گونا گوں پہلو ہیں، تو ان سب کے بیان میں بوریت ہی آئے گی۔ بے کیفی اور

سپاٹ پن ہی آئے گا۔ اس کی مثال میں فردوسی کے شاہنامہ کا حوالہ دیا ہے۔ اختر الایمان کے نظریہ کے مطابق شاہنامہ کا بڑا حصہ کلام منظوم کی ذیل میں آجاتا ہے۔

محمود ایاز نے اپنے اس طرز استدلال سے اختر الایمان کے 'آمد و آورد' کے بچے تلے معیار کو نظم کی جانچ پرکھ میں انفِٹ قرار دیا ہے چونکہ یہاں اس کو ملحوظ رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ البتہ غزل کی سقم و صحت میں اس معیار کو روا رکھا ہے۔ اختر الایمان، محمود ایاز کے اس استدلال کو ایک گونہ تسلیم کرنے کے باوجود اپنی بات پر اٹل رہے اور کہا کہ فردوسی کے شاہنامہ یا اس جیسی طویل نظمیں شعری بصیرت کے بغیر نہیں لکھی جا سکتیں۔ چنانچہ جو چیز قاری کو متاثر کرتی ہے، وہ نظم کے الفاظ اور تراکیب ہیں۔ اور مناسب و موزوں الفاظ شعری بصیرت کے بغیر نہیں آتے۔

لیکن محمود ایاز، اختر الایمان کے اس تاویل کو بھی مسترد کرتے ہوئے اسے شعری بصیرت کے بجائے 'کرافٹ مین شپ' کا ہنر بتایا ہے اور کہا ہے کہ الفاظ پر عبور، مشاقی و الفاظ کا ہاتھ باندھے کھڑا رہنا، پھر اسے منظوم کرنے کا ہنر کرافٹ مین شپ ہے۔ اختر الایمان نے اس بات کو بھی تسلیم کیا لیکن پھر بھی اپنی بات پر اٹل رہے، یہ کہہ کر کہ منظوم کلام میں آمد کا عمل دخل ناگزیر ہے۔ انھوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت اس طرح پیش کی ہے:

> ''وہ ہے درست ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ آمد جو ہے، وہ پہلا جملہ ہوتا ہے ذہن کا۔ یا ایک خیال آتا ہے جسے آپ شکل دیتے ہیں، نظم کی۔ اس کے بعد آورد کا حصہ تو ہوتا ہی ہے۔ مگر وہ آورد کے ساتھ اتنی مل جاتی ہے کہ آمد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال میں خود اپنی نظم کو پیش کیا ہے۔ جس میں انھوں نے چھوٹی بحر میں ایک نظم لکھی تھی۔ اسے مکمل کرنے کے بعد انھیں لگا کہ نظم تو ہے، یہ مگر جس طرح وہ چاہتے تھے، کام نہیں بنا۔ بالآخر دوسری بحر میں وہ نظم از سر نو مکمل کی۔ ۲

خلاصہ کے طور پر اختر الایمان اس بات کے قائل ہیں کہ تخلیقی کام، چاہے وہ چھوٹا ہو کہ بڑا، اس میں 'آمد' کا ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور اس کے عمل دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شعری بصیرت اس سے نکل کر نہیں جاتی۔ معلوم ہوا کہ اس شعری بصیرت کا دوسرا نام ہی آمد ہے۔

محمود ایاز اب ان کی زبان سے وہ سننا چاہ رہے تھے، جو اس انٹرویو کا اہم مقصد ہے۔ ان کی زبان

سے وہ بات کہلوانے کے لیے اگلا سوال اس طرح تھا:

''اب میں آپ سے ذرا سی وضاحت طلب کروں گا کہ آمد کا جو لفظ آپ استعمال کرتے ہیں، کیا آپ کے ذہن میں اس کا کوئی خاص مفہوم ہے؟۔
ہمارے یہاں شاعری میں 'آمد' کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس کی وجہ سے سننے والوں کو ذرا غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ کچھ کھل کر کہیں تو بات یوں ہو سکتی ہے کہ جب شعر میں تاثر، جذبہ، احساس کی ترسیل کی کیفیت نہ ہو تو یہ عموماً اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ بات اوپر سے لادی جا رہی ہے۔''

یہ سوال اختر الایمان کے لیے کسی قدر مشکل ثابت ہوا۔ چونکہ انھوں نے ایک مبہم سا جواب دے کر مزید ایک سوال کو دعوت دے دی۔ محمود ایاز اس جواب سے خود کو غیر مطمئن پا کر اپنے سوال کی مزید وضاحت میں علامہ اقبالؒ کے متعلق آرا کو پیش کیا۔ مثلاً یہ کہ اقبال کی شاعری کے بارے میں دو متضاد قسم کی آرا ہیں۔ کچھ لوگ تو شاعر ہی نہیں مانتے، صرف مفکر یا فلسفی مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ تو فلسفہ دلسفہ بہت تھا ان کے یہاں۔ شعر تو انھوں نے کہا نہیں کچھ۔ لیکن اس پر اختر الایمان کا جواب ہے کہ وہ اپنے فکر اور نیت میں مخلص ہیں۔ یا صاحب شعرا اپنے ارادے میں نیک ہیں۔

محمود ایاز ان کے متعلق مختلف خیال کے لوگ اور ان کی آرا پیش کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں، جو ہر چیز کو شاعری اور اچھی شاعری ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی مثال میں یہ شعر پیش کیا ہے ؎

سبق پڑھ پھر شجاعت کا، صداقت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ جو جذبہ ہے، جس خیال کا اس شعر میں اظہار ہے، ممکن ہے وہ اس میں صادق ہیں، دل سے یقین رکھتے ہیں، اندرونی کمپلشن سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہ شاعری نہیں بکواس ہے۔ جب کہ دوسرے شعر کے متعلق علامہ اقبال کو بڑا شاعر کہتے ہیں ؎

آبِ رواں کبیر، تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے آنے کا

دوسرے شعر کو عمدہ شعر تسلیم کیا ہے جبکہ پہلے کو محض خطابت اور وہ بھی بری خطابت کہا ہے۔

اختر الایمان نے اس مرحلہ پر آورد کی آمیزش کو قابل معاف گردانا ہے۔اور کہا کہ اتنی چھوٹ دینی ہی پڑے گی کیونکہ کچھ حصہ ہمیشہ آورد کا رہے گا، کچھ آمد کا رہے گا، کچھ جبر کا اور کچھ اسپان ٹینٹی کا۔

محمود ایاز اب آہستہ آہستہ ان کے سامنے اپنا اصل مدعا پیش کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اختر الایمان کے تازہ مجموعہ کلام ''زمین زمین'' کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے خود کو ان کی شاعری کا مداح ہونے کی یقین دہانی کراتے ہیں۔پھر اپنی بات اس طرح پیش کرتے ہیں:

''ورسیفکیشن کی جو بات آپ نے دوسروں کے بارے میں کہی تھی، وہاں سے میں نے اپنی بات اس لیے شروع کی تھی کہ دراصل مجھے یہ کہنا تھا کہ آپ کی ادھر کی نظموں میں یہ Versification والا معاملہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔''

اختر الایمان اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں:

''ہوسکتا ہے۔دیکھیے، میں تو ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کچھ کہتے ہیں، شاعر کچھ کہتا یا لکھتا ہے، تو تب تک وہ اس کا ہے، اس کے بعد.........
یعنی ایک بار وہ چیز چھپ گئی تو لوگوں کے پاس چلی گئی تو وہ پبلک پراپرٹی ہوگئی۔میں نے جو ٹھیک سمجھا وہی کیا۔مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں ورسیفکیشن بھی دکھائی دے سکتا ہے۔میں اپنے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذہن میں ورسیفکیشن کی کوئی بات نہیں تھی۔''

محمود ایاز کا اگلا سوال ان کی شاعری میں آئی تبدیلی کی وجوہات سے متعلق ہے نیز یہ تبدیلی شعوری ہے یا غیر شعوری یا پڑھنے والوں کو یہ محسوس کرانے کی کوشش ہے کہ شاعری میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، یا ہونا چاہیے اور ہو رہا ہے۔......لیکن اس سے قبل محمود ایاز نے اختر الایمان کو یہ احساس دلا یا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانہ میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔اور 1960 کے اوائل سے، جو محمود ایاز کے سوغات کا زمانہ تھا، وہ شاعری کی طرف کچھ زیادہ متوجہ ہوئے۔نئے لکھنے والوں کے دلوں میں گھر کیا اور خوب داد و تحسین پائی۔دائرہ اثر بنا۔ان کے مقابلہ میں جو مقبول ترین لوگ مانے جاتے تھے، نظروں سے

گر گئے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی شاعری وقتی موضوعات کا احاطہ کر رہی تھی، اور انداز بھی اتنا ہی وقتی تھا۔جس کے سبب اس کی اپیل زیادہ دور تک نہیں جا سکتی تھی۔اس کے برعکس اختر الایمان کے کلام میں یہ خوبی تھی کہ آہستہ آہستہ پڑھنے والوں پر سحر کرتی، جادو جگاتی۔

اختر الایمان نے یہاں محمود ایاز کے اٹھائے گئے سوال کا سرے سے انکار نہیں کیا ہے،۔بلکہ دبے لفظوں میں ان کی باتوں کا اعتراف کیا ہے۔اس کی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ ان کے سامنے زبان کو وسعت دینے کا مقصد بھی رہتا ہے۔اور وسعت سے مراد وہ اظہار کے لیے الفاظ کے امکانات کی توسیع لیتے ہیں۔اور نئے موضوعات کو اپنانا بھی مقصود ہوتا ہے۔

مکالمہ ان کی شاعری کے دیگر پہلوؤں کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔لیکن یہاں اس سے صرف نظر کرتے ہوئے خلاصہ کلام پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اختر الایمان ان الفاظ میں اپنا دفاع کرتے ہوئے بات ختم کرتے ہیں:

”کچھ موضوعات مجھے پسند ہوتے ہیں۔کبھی ایک نظم شروع کرتا ہوں۔پھر چھوڑ دیتا ہوں۔کبھی ایک مصرع لکھا، کبھی چھوڑ دیا۔زمانہ کے بعد خیال آتا ہے کہ کہوں۔آدھا پورا ہوتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہوں۔......ممکن ہے یہ جو کچھ کوشش ہے، پہلے پکڑنے کی کوشش کرنا، پھر پکڑ میں نہ آنا، اس کی وجہ سے شاید آپ کو یہ ڈسیٹسفکشن محسوس ہوتا ہے۔“

ماخذات

☆ یادرفتگاں محمود ایاز — از: شائستہ یوسف
☆ نقش برآب (مجموعہ کلام) — از: محمود ایاز
☆ رسالہ سوغات — شمارہ 3، دور اول، و شمارہ 1 رماہ ستمبر 1991
☆ رسالہ 'جنوبی ہند کا بہترین ادب' — مطبوعہ 1958، زیر اہتمام مجلس ادب بنگلور
☆ مضمون بعنوان 'اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر' بقلم علی حفیظ، بنگلور
☆ راقم کی ذاتی ڈائری و نوٹس

حمید الماس

گلبرگہ، جو بزرگان دین اور صوفیائے کرام کا مسکن رہا ہے۔ وہ یہیں مدفون بھی ہیں۔ یہ شہر علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ بہمنی سلطنت میں دارالخلافہ بھی رہا ہے۔ جب تک دکن کا حصہ رہا، اس کی تاریخ روشن رہی ہے۔ اس تاریخی حیثیت کی حامل سرزمین سے کئی نامور شخصیات ابھری ہیں۔ جنھوں نے الگ الگ میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ انہی میں ادبی افق پر جو آفتاب طلوع ہوا اور ایک جہاں کو اپنی ادبی ضیا پاشی سے منور کر گیا، اردو دنیا اسے حمید الماس کے نام سے جانتی ہے۔

قصبہ سگر شریف معروف بہ ساگر (تعلقہ شاہ پور) گلبرگہ سے 100 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و خلیفہ صوفی سرمستؒ جنھوں نے یہاں جہاد کیا تھا، کی ابدی آرام گاہ ہونے کے سبب لوگوں کی نگاہ میں یہ مقام قابلِ احترام مانا جاتا ہے۔ حمید الماس اسی قصبہ سگر شریف کے ایک متوسط گھرانے میں 7 ردسمبر کو پیدا ہوئے۔

سنہ پیدائش میں 1935/1932 کا اختلاف ہے۔ لیکن بوجوہ 1932 کو درست مانا گیا ہے۔ والد کا نام جناب عبدالرزاق، دادا کا نام جناب محمد صاحب تھا۔ والد نا خواندہ، جبکہ دادا قدرے اردو شناس تھے۔ زراعت و تجارت ذریعۂ معاش تھا۔

عبدالحمید (معروف بہ حمید الماس) نے ابتدائی تعلیم اسی قصبہ سگر شریف کے مدرسہ تعلیم القرآن میں حاصل کی۔ بچپن ہی سے ان کی طبیعت کا میلان کسب علم کی طرف رہا۔ ان کے اس ذوق کو متقی و پرہیزگار جد امجد نے جلا بخشا۔ انہی کی زیر تربیت روزانہ بہ آواز بلند اخبار پڑھ کر اردو سے روشناس اور رواں ہوئے۔ تعلیم القرآن میں دوران طالب علمی موقع بہ موقع شعر وسخن کی طرف ان کے میلان کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک موقع پر ان کے استاد نے ان میں اس خوابیدہ صلاحیت کو بھانپ کر بشارت دی تھی کہ 'عبدالرزاق کے گھر ہیرا پیدا ہوا ہے' جو واقعی اردو دنیا کے لیے ہیرا ثابت ہوئے۔

بہت سے ادبا، شعرا اور صلحا کی طرح زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں حمید الماس کو بھی غم کے کڑوے گھونٹ پینے پڑے۔ اور صبر آزما حالات سے گذرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ ماں کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ جس سے حمید الماس زبردست ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئے۔ مکتبی تعلیم متاثر ہی نہیں، منقطع ہو گئی۔ ابھی وہ ماں کی موت کے غم سے سنبھل بھی نہ پا[illegible] ایکشن کے الم ناک حادثہ میں والد شہید ہو گئے جس سے ان کا غم اور بھی گہرا ہو گیا اور صغر سنی ہی میں یتیم و یسیر ہو گئے۔ ان ناساعد حالات سے انھیں جو دکھ پہنچا تھا، اس کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے۔

بہر حال حالات کی ستم ظریفی نے انھیں حیدر آباد منتقل ہونے پر مجبور کیا۔ یہاں منتقل ہو کر عزم و حوصلہ بلند رکھا، اپنے طور پر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح محض بارہ سال کی عمر میں جامعہ نظامیہ حیدر آباد دکن سے منشی کا امتحان بہ زبان فارسی پاس کیا۔ مملکت آصفیہ نے اس سند کو ایس ایس ایل سی کے مساوی قرار دیا تھا۔ اس کامیابی کے ساتھ ہی آئندہ سال منشی فاضل جو گریجویشن کے مساوی تھا، کا امتحان پاس کر لیا۔

حمید الماس اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھے۔ بھائیوں میں عبدالغنی، عبدالسلام اور بہنوں میں ہاجرہ بی و رابعہ ہیں۔ سبھی اچھی تعلیم و تربیت پا کر برسر روزگار ہوئے۔ حمید الماس نے ملازمت پیشہ کیریئر کا آغاز 1948 میں محکمۂ محنت میں ملازمت اختیار کر کے کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ قبل ازیں ان کی تقرری بحیثیت معلم ہوئی تھی، لیکن وہ ماحول انھیں راس نہیں آیا تو اسے ترک کر کے 8 جولائی 1948 کو رائچور میں دوسرے درجے کے کلرک کی حیثیت سے ملازمت شروع

کی۔ تین سال بعد 1951 میں ان کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا۔ ان دنوں رائچور، بیدر اور گلبرگہ مملکت آصفیہ حیدرآباد کے تحت تھے۔

تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا اور 1956 میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کی از سر نو تقسیم عمل میں آئی، جس سے رائچور، بیدر اور گلبرگہ ریاست میسور کے حصے میں آ گئے۔ گلبرگہ ان کا آبائی وطن ہونے کے سبب وہاں تبادلہ ہو گیا۔ اب وہ ریاست میسور کے ملازم ٹھہرے۔

ملازمت کے ابتدائی برسوں میں دفتری زبان اردو تھی۔ لیکن جب انگریزی کا غلبہ ہوا، اور دفتری کام کاج انگریزی میں ہونے لگے تو محنت و لگن سے اس حد تک انگریزی سیکھ لی کہ روانی سے بول بھی لیتے تھے، اور لکھنے پر بھی قادر تھے۔ بعد میں کنڑ زبان جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسے بھی نہ صرف سیکھا، بلکہ اس سے متعلق امتحانات بھی پاس کیے۔

سرکاری ملازمت کی کل 42 سالہ مدت کے دوران مختلف شہروں اور اضلاع کو ان کے تبادلے ہوئے۔ رائچور، حیدرآباد، ہبلی، بلاری اور گلبرگہ میں خدمت پر مامور رہے۔ اس دوران وہ اپنی ذمہ داریوں کے متعلق فرض شناسی اور قابلیت کا ثبوت دیتے ہوئے بتدریج ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدے تک پہنچ گئے۔ حتیٰ 1971 میں جب ان کا تبادلہ بنگلور ہوا تو یہاں کل بیس برس خدمات انجام دے کر ہیڈکوارٹر اسسٹنٹ اور اکاؤنٹ آفیسر کے عہدے سے 1990 میں سبکدوش ہوئے۔ ایمانداری، فرض شناسی اور اصول پسندی ان کا اصل جوہر تھا۔

بنگلور کو ان کی منتقلی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چونکہ یہاں محکمہ کے اعلیٰ حکام سے ذاتی وابستگی کے دروازے کھلے، اور قربت کا موقع ملا۔ جس سے راست اور غیر راست طور پر فائدہ پہنچا۔ واقعہ یوں نقل کیا گیا ہے کہ یہاں ان کے تبادلے کے چند ماہ بعد ہی ڈاکٹر سدیا پرانک (آئی اے ایس) بہ حیثیت لیبر کمشنر مقرر ہو کر آئے۔ وہ کنڑ کے قدآور شاعر اور ادیب تھے، جامعہ عثمانیہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ لہٰذا اردو سے بھی واقف تھے۔ غرض انھیں جب حمید الماس کی شعری لیاقت اور اردو دانی کا علم ہوا تو حمید صاحب کو نجی اسٹاف میں شامل کر لیا۔ رفتہ رفتہ علمی اور ادبی موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، کمشنر کو جب علم ہوا کہ انھوں نے شری بسویشور کے وچنوں کا ترجمہ کیا ہے، تو پسندیدگی کا اظہار کیا حتیٰ کہ جب یہ کتابی شکل میں آئی تو اس کے لیے دیباچہ بھی تحریر کیا۔ ان

سے اس تعلق کے ضمن میں انھیں دیگر اعلیٰ عہدے داروں سے بھی راہ ورسم ہوئے اور اس ربط وضبط سے مختلف نوعیت کے فائدے پہنچے۔ دلچسپ بات یہ کہ بعد میں آنے والے بھی لیبر کمشنر نے انھیں نجی اسٹاف میں شامل رکھا۔ ملازمت کے پورے کیریئر میں محکمہ میں ہر رتبہ کے لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کے محبوب نظر اور ہر دلعزیز رہے۔

حمید الماس کی شادی 1954 میں زبیدہ خاتون سے ہوئی جو سگر شریف کے تعلقہ شاہ پور سے تعلق رکھتی تھیں۔ تعلیم یافتہ اور سادہ طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کے بارے میں کتاب 'یاد رفتگاں: حمید الماس' میں لکھا ہے کہ جب وہ حمید الماس کی زندگی میں آئیں تو کتاب زیست کے ہر ایک باب میں ان کا دل دھڑکنے لگا۔ اور ایک پاکیزہ اور مضبوط رشتے کی ابتدا ہوئی۔ جس کا وہ شادی کے موقع پر لکھی گئی نظم میں اعتراف کرتے ہیں:

نیا تصور تکمیل کار لائی ہو
جواب عظمت پروردگار لائی ہو
دہک رہا تھا گلوئے حیات مدت سے
بہ صد خلوص محبت کے ہار لائی ہو
چرا کے آنکھ میں لائی ہو رنگ صبح ازل
بچا کے دستِ خزاں سے بہار لائی ہو
دھڑک رہا ہے ہر ایک باب میں دلِ الماس
کتاب زیست کو یوں زرنگار لائی ہو"

ان کی زندگی میں آنے والی زبیدہ خاتون، ہر اعتبار سے باعث راحت وسکون اور نیک و صالح بیوی ثابت ہوئیں۔ وفا شعار اور خوش اطوار بیوی نے ان کی ہر طرح کے آرام وآرائش کا خیال رکھ کر حقیقی معنوں میں 'راحت وسکون' ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ مصنف کتاب اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''زبیدہ خاتون نے زندگی کے ہر معاملے میں اپنے شوہر کا بھرپور ساتھ

دیا۔ ان کے نازک مزاج کو سمجھتے ہوئے ان کی ضرورتوں، آسائش و آرام اور صحت کا پورا پورا خیال رکھا اور ان کی موت تک ان کی ہر طرح سے خدمت کی۔ حمید الماس ادبی اور دفتری کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ اور نہایت ہی محنتی تھے۔ اس کے برعکس گھریلو کام کاج اور ذمہ داریوں سے وہ بڑی حد تک بے نیاز رہے۔ ان کے اس مزاج کو سمجھ کر ان کی اہلیہ نے اکیلے گھر، شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بہت ہی سلیقے سے نبھائی۔"

حمید الماس اور زبیدہ خاتون کی تین اولاد ہیں۔ بڑے بیٹے ملنسار اظہر احمد اس وقت آکاش وانی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں، دوسرے بیٹے ڈاکٹر ملہار قیصر احمد بنگلور کے ایک مشہور کالج میں اسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ جبکہ تیسرے فرزند بلہار اظہر ملازمت کے سلسلے میں نیوزی لینڈ میں مقیم ہیں۔ ان کی حیات ہی میں تینوں فرزند تعلیم و تربیت پاکر روزی روزگار سے جڑ گئے۔ حمید الماس اپنے بیوی بچوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کے مستقبل کے تئیں ہمیشہ فکر مند بھی رہتے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ان کی اہلیہ کو جب دق کا مرض لاحق ہوا تو انھیں یہ فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے شوہر بھی اس سے متاثر ہو جائیں۔ اس پر حمید الماس نے ازدواجی رشتے کی استقامت اور بے پناہ محبت کا اظہار نظم 'ٹی بی' لکھ کر کیا تھا، ملاحظہ کیجیے:

تجھ کو ڈر ہے کہ
ترے جسم ترے خوں کا زہر
مری رگ رگ میں سرایت نہ کہیں کر جائے
جیتے جی میں بھی نہ بن جاؤں کہیں پیکرِ سرد
کاش تجھ کو ہو خبر
یہ لرزتی ہوئی بجھتی ہوئی زنجیر ازل
جس کے آغوش میں جکڑے ہوئے آسودہ ہیں ہم
نہیں پگھلی، نہ پگھل سکتی ہے
درد کی آگ کی ان لمبی زبانوں سے کبھی

کاش تجھ کو ہو خبر
میں ترا جسم تری روح بھی ہوں
مشترک روگ ہے تیرا میرا"

اس نظم میں میاں بیوی کے اٹوٹ رشتے، اور خلوص و محبت کو 'دو جسم ایک قالب' کی خوبصورت تعبیر میں پیش کیا ہے، جس میں سدا ابھر کی رفاقت اور بے پناہ محبت کا اظہار ہے۔ ان کا یہ کلام دل کے نہاں خانہ میں پنہاں آفاقی جذبۂ محبت اور ایک مخلص اور سچے رفیق سفر حیات ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

سیرت و شخصیت

ان کی سیرت و شخصیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حمید الماس نازک مزاج، نفیس طبیعت، کم سخن، فرض شناس اور صلح پسند انسان تھے۔ وہ ایک پر کشش شخصیت کے مالک اور غیرت و حمیت کے پیکر شخص تھے۔ عزت نفس پر آنچ آنا انھیں کسی طرح گوارانہ تھا۔ طویل قامت، خوش پوشاک، نرم دم گفتگو، شیریں زباں تھے اس سے ان میں شاہانہ شان و شوکت جھلکتی تھی۔

ان کی پر کشش اور بارعب شخصیت کا جو خاکہ کتابوں میں ملتا ہے، وہ اس طرح ہے:

"اونچا قد، کشادہ ماتھا، سلیقے سے پیچھے کی طرف جمے ہوئے بال، گھنی بھویں، روشن شفاف آنکھیں، بخر وطی کان، ستواں ناک، ملائم گال، مونچھوں سے بے نیاز پر کشش ہونٹ، چوڑا شانہ، کشادہ سینہ، لمبے لمبے ہاتھوں کی لمبی لمبی آرٹسٹک انگلیاں، نفیس، نازک اور ملائم جلد، صاف کھلتا ہوا رنگ کبھی کبھی شہابی لکیر گالوں میں نظر آتی۔ نفیس اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، چہرے پر ملاحت، چال میں اعتماد، نرم اور میٹھی آواز میں گفتگو ان کے حلیے اور شخصیت کی جاذبیت میں آخری سانس تک کمی نہیں آئی۔"

یہ نفاست، وقار، متانت اور سنجیدگی ان کے ہر کام میں نظر آتی۔ ہر کام نہایت سلیقہ مندی سے انجام دینا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ انھوں نے سیدھی سادی زندگی بسر کی۔ گھر میں پڑھنے لکھنے کے بنیادی وسائل تک نہ تھے۔ زندگی کے ہر موڑ پر محتاط رویہ اختیار کیا اور کفایت شعار

رہے۔ ساری زندگی کرایے کے مکان میں بسر کرنا ان کا مقدر بن گیا تھا۔ بار بار گھر کی تبدیلی سے انھیں سخت اذیت پہنچی جس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک آزاد نظم میں کیا ہے۔ وہ اپنے کرب کا اظہار کس طرح کرتے ہیں، ذیل کے بند میں ملاحظہ فرمائیے۔

''گھومتا پھرتا ہوں روز و شب
مکاں کی جستجو میں
شہر کی خاموش گلیاں
میری آہٹ سن کے
دامن کھینچ لیتی ہیں
کشادہ راستوں میں
چلتے چلتے پاؤں زخمی ہو گئے ہیں
مشقت اور محنت مل گئیں سب خاک میں......''

فطرتاً وہ خاموش طبیعت اور کم سخن تھے۔ لہٰذا عوامی بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ آرائیوں میں رہنا انھیں پسند نہ تھا۔ حتیٰ کہ دوست واحباب کے حلقہ میں بھی کم سے کم شریک ہوتے۔ اپنے خلاف بے جا تنقید و بدزبانی کا جواب عموماً 'خاموشی' اختیار کر کے دیتے۔ مخالف سے نپٹنے کا یہی ان کا ہتھیار تھا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ ''ان کی گفتگو مٹی، میری خاموشی سونا''

عادت واطوار میں سگریٹ نوشی کی عادت تھی۔ امپورٹیڈ اور اعلیٰ قسم کے سگریٹ پینے کا شوق تھا۔ مے نوشی سے ہمیشہ اجتناب کیا، باوجود اس کے کہ دوست واحباب اس بری لت کی لعنت میں گرفتار تھے۔

حمید الماس کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب کے مصنف ملنسار اطہر احمد نے ان کے روزانہ کے معمول کو اس طرح نقل کیا ہے:

''حمید الماس ہر حال میں بلاناغہ روز سر سے نہاتے تھے۔ اپنے تینوں بیٹوں کو ان کے بچپن میں اکثر اتوار کو خود نہلاتے تھے اور نہلانے کے دوران مشہور شاعروں کی نظمیں بہ آواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ نہانے سے قبل ایک گلاس نیم

گرم پانی میں لیمو کے چند قطرے اور ایک چمچہ شہد ملا کر ضرور پیتے اور داڑھی بناتے۔ البتہ چھٹی کے دن محرم کے مہینے میں یوم عاشورہ اور ذی الحجہ کے مہینے میں عیدالاضحی تک صرف داڑھی کا ناغہ کرتے۔ نہانے کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔"

موصوف مصنف نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ ان کی وفات کے بعد جب ان کا قرآن کھول کر دیکھا گیا تو اس میں ایک پرچہ ملا، جس سے پتہ چلا کہ انھوں نے اپنے کئی مرحوم احباب اور عزیزوں کے لیے قرآن پڑھ کر بخشا تھا۔ نیز یہ کہ نماز اور تلاوت کے بغیر کبھی ناشتہ نہیں کیا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ درد شکم کے سبب مرحوم تاحیات روزہ رکھنے سے معذور رہے، لیکن تراویح پابندی سے پڑھی۔ فریضۂ حج ادا نہیں کر سکے۔ اس حسرت کو ان کی اہلیہ نے حج بدل کر کے پورا کیا ہے۔ مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے۔ جبکہ ان کی اہلیہ اہل سنت والجماعت تھیں۔ لیکن ان کا ظرف اتنا وسیع تھا کہ کبھی کسی پر اپنا مسلک تھوپنے کی کوشش نہ کی۔

ادبی سرگرمیاں

حمید الماس کی ادبی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا آغاز سرزمین حیدرآباد سے ہوا، جہاں وہ والدہ کی داغ مفارقت کا غم لے کر اپنے برادر مکرم عبدالغنی کے پاس پہنچے۔ وہ وہاں مملکت آصفیہ میں ملازم تھے۔ خود بھائی کا ادب سے پائیدار رشتہ، مختلف ادبی جرائد و رسائل کی روزانہ ان کے یہاں آمد پھر وہاں کا اردو کا پر کیف ماحول، ان سب نے ان میں ادب سے فطری لگاؤ اور ذوق سخن کی دبی چنگاری کو ہوا دی، ان کے ذوق ادب کو سازگار ماحول ملا اور وہ ابھرتا گیا۔ اس طرح حیدرآباد کے ادبی ماحول اور اردو نواز معاشرہ نے ان کی شاعرانہ شخصیت و فکر و فن کی تشکیل میں مہمیز کا کام کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں رائچور میں تین سال قیام کے دوران انھیں شاعر و ادیب رحمٰن جامی کی شکل میں مخلص دوست ملا تھا۔ چنانچہ ان کے ایک بیان کے مطابق 1948 سے قبل ہی حمید الماس نے فکر سخن کی طبع آزمائی شروع کر دی تھی۔ اخبارات و رسائل میں ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا۔ مشاعروں میں شرکت اور اخبارات میں کلام کی اشاعت سے شہر رائچور میں بہ حیثیت شاعر انھیں پہچان ملی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد یعنی 1951 میں ان کا تبادلہ جب

حیدرآباد ہوا تو یہاں کل پانچ سال قیام رہا۔ اس دوران مدت وہ ہر اعتبار سے مستحکم اور برسرروزگار تھے۔ لہٰذا اپنی ادبی حیثیت اور فکر وفن کو مزید مستحکم کرنے پر زور دیا۔ یہ ان کی ادبی شخصیت کا تشکیلی دور تھا۔ غرض اس کے نتیجہ میں برصغیر کے جرائد ورسائل میں ان کا کلام جگہ پانے لگا۔ ان کی تخلیقی صلاحیت کو رسالہ 'صبا' کے دفتر (واقع معظم جاہی مارکیٹ) نے بھی پروان چڑھایا۔ سلیمان اریب کی زیرادارت نکلنے والا یہ رسالہ نوجوان شعرا اور ادبا کا ترجمان اور اس کا دفتر ان ادب نوازوں کی جائے ملاقات ومشقِ سخن ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ حمید الماس اپنے ایک مضمون لکھتے ہیں کہ:

''صبا کا مختصر سا دفتر شاعروں اور ادیبوں کا مسکن اور مامن تھا۔ اس کرے میں
کئی ادبی معرکے ہوئے۔ نئے لکھنے والوں کی ذہنی اور قلبی تربیت ہوئی۔''

یہی وہ دفتر تھا جہاں روزانہ شام کو وقت کے اہم شعرا ادبا اور نئے لکھنے والے بھی جمع ہوتے تھے۔ ادبی موضوعات پر گفت وشنید ہوتی۔ شعری ونثری تخلیقات پر تبصرے وتنقید ہوتے۔ ان نشستوں میں سلیمان اریب، لطیف ساجد، غفور انیس، شاہد صدیقی، سرور ڈنڈا، انور معظم، ابن احمد تاب، زبیر رضوی، مغنی تبسم، سردار الہام، عزیز قیسی، اقبال متین، وحید اختر، شاذ تمکنت، عوض سعید اور حمید سلیمان پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ان رفقا کی صحبت ومعیت میں انھیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ جب حیدرآباد چھوڑا تو اس وقت تک ادب کے قومی افق پر ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت اور پہچان بنا چکے تھے۔

حمید الماس کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہند و بیرونِ ہند کے تمام موٴقر جرائد ورسائل نے ان کے کلام کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ ہندستانی رسالوں میں صبا، شاہراہ، شاعر، تحریک، آہنگ، شعر وحکمت، آجکل، کتاب، شاہکار، سب رس، سوغات، جواز، سطور، شب خون، کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی رسالوں میں ادبی دنیا، ادب لطیف، اوراق، الشجاع، اور فنون کے نام آتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستانی جریدوں میں وہ اس تواتر کے ساتھ چھپے کہ عام قارئین کے ساتھ شعرا ادبا کو بھی ان کے پاکستانی نژاد ہونے کا گمان ہوگیا۔ اس تعلق سے رسالہ 'شب خون' کے مدیر شمس الرحمٰن فاروقی کی درج ذیل تحریر ملاحظہ کیجیے:

''شروع میں جب ہندوستان میں خال خال ہی اچھے ادبی پرچے نکلتے تھے، تو

حمید الماس کا کلام زیادہ تر پاکستان میں چھپتا تھا۔اس حد تک کہ بعض لوگ انھیں پاکستانی شاعر سمجھتے تھے۔ہندوستان کے اچھے ادیبوں کو'شب خون' کی طرف ملتفت کرنے کے لیے اور انھیں ایک معتبر اور مستقل میدان فراہم کرنے کے لیے میں نے شروع شروع میں'شب خون' کے صفحات پاکستان کے ادیبوں کے لیے بند رکھے تھے۔ایک بار جب میں نے'شب خون' میں اپنے ہم کار حامد حسین حامد مرحوم سے کہا کہ بھائی'شب خون' کے لیے حمید الماس کا کلام منگواؤ تو انھوں نے کہا کہ وہ تو پاکستانی ہیں۔تب میں نے ان کی غلط فہمی رفع کی۔حمید الماس ان دنوں گلبرگہ ہی میں رہتے تھے۔اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ہماری درخواست پر انھوں نے شب خون کے لیے کلام بھیجا۔"

اس کے بعد شب خون میں متواتر ان کا کلام شائع ہونے لگا۔جملہ طور پر شب خون کے کل 31 شماروں میں 109 شعری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔جو ایک تخمینہ کے مطابق پورے جنوبی ہندستان کے تخلیق کاروں میں حمید الماس کی شائع تخلیقات کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ان کی مقبولیت کی دوسری دلیل یہ کہ منتخب تخلیقات پر مشتمل شب خون کا آخری شمارہ دو ضخیم حصوں میں شائع ہوا۔اس میں بھی حمید الماس کی 27 نظمیں شائع ہوئی ہیں۔علاوہ ازیں ان کی بیشتر نظمیں سال کی بہترین نظموں کے طور پر منتخب ہوئیں۔شاہکار، نئے نام اور'شاعر' کے'ہم عصر ادب نمبر' میں بھی آپ کا کلام نمایاں طور پر رسالہ کا زینت بنا ہے۔

بحیثیت شاعر ان کی مقبولیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بہت سی نظموں کا دیگر ہندستانی زبانوں میں مثلاً ہندی، ملیالم، کنڑ، مراٹھی، گجراتی، کشمیری، اور پنجابی میں ترجمہ ہوا ہے۔حتیٰ کہ بعض نظمیں انگریزی اور روسی زبان میں بھی منتقل کی گئی ہیں۔

ان کی شخصیت کا ایک پہلو ترجمہ نگاری بھی ہے۔اس فن میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔خاص طور سے کنڑ کی ادبی باریک بینی سے بھی بخوبی واقف تھے۔بحیثیت مترجم ان کی خدمات کا اندازہ ذیل کی تحریر سے ہوتا ہے۔

''حمید الماس خود ایک اچھے مترجم تھے۔ وہ کنڑ ادب کے رمز شناس تھے۔ انھوں نے پہلی بار کنڑ ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کر کے دونوں زبانوں کے درمیان کی خلیج پاٹنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے کنڑ کے صوفی سنت شاعر شری بسویشور کے ایک سو آٹھ منتخب وچنوں اور ان کی سوانح کا اردو میں ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں کنڑ کے 17 نامور شاعروں کی 45 نظموں، قد آور اور ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ افسانہ نگار ماستی وینکٹیش آئینگار کی 15 کہانیوں اور کنڑ کے معروف شاعر و ادیب پنجے منگیش راؤ کی سوانح کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔''

اس کے علاوہ کنڑ زبان میں ادبی و دینی مضامین بھی لکھے۔ اور اردو میں کنڑ زبان کے ادبی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ دو میعاد کے لیے روزنامہ سالار کے ادبی ایڈیشن سے وابستہ رہے۔ موقع بہ موقع حالات حاضرہ اور سلگتے مسائل پر اداریے بھی تحریر کیے۔

خدا نے انھیں عجیب ذوق دیا تھا، جو اوروں سے بالکل جدا۔ انھیں قیمتی قلم اور ڈائریاں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس سے وہ ڈائریوں میں اپنی نظمیں بڑی سلیقہ مندی سے تحریر کیا کرتے تھے۔ ادب کے تقریباً نصف صدی کے طویل سفر میں بطور یادگار تیرہ کتابیں چھوڑ گئے۔

ملازمت کے سلسلے میں جہاں بھی تبادلہ ہوا، باوجود اس کے کہ کم گو اور مجلس و محفل کی ہنگامہ آرائی سے خود کو کنارہ کش رکھتے ہیں۔ پھر بھی وہاں کے ادبی حلقے سے وابستہ رہے، سب سے راہ و رسم رکھا اور دوست و احباب کا حلقہ رہا۔ بطور خاص جب بنگلور کو تبادلہ ہوا تو 31 سال کا طویل عرصہ یہاں گذارا، جو وطن ثانی بن گیا۔ چنانچہ یہاں بھی ادب نوازوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے حلقۂ احباب اور ملاقاتیوں میں شامل ہوگئی۔ ان میں ماہر منصور، یوسف عارفی، منیر احمد جامی اور عارف متین کے نام خاص طور سے آتے ہیں۔ کرناٹک و حیدرآباد کے علاوہ برصغیر کی چند ادبی شخصیات سے بھی بذریعہ مراسلت شناسائی اور مراسم تھے۔ ان میں بالخصوص شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج کومل، اور ڈاکٹر عزیز تمنائی سے خاص لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اور ڈاکٹر وزیر آغا کی بھی عزت و احترام کرتے تھے۔

حمید الماس کے لیے یہ بھی اعزاز کی بات تھی کہ انھیں مختلف کل ہند مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ اس دوران چوٹی کے شعرا و ادبا سے ملاقات اور ہم نشینی کا موقع ملا۔ نیز ان کے ساتھ کلام سنانے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان ادبی ہستیوں میں جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، اور دیگر ہم عصر شعرا کے نام بھی آتے ہیں۔ حتیٰ کہ میسور کا دسہرہ اپنی رنگارنگ دیگر پروگراموں کے علاوہ ثقافتی پروگرام کے لیے بھی مشہور ہے۔ انھوں نے 1960 میں کوی سمیلن کے موقع پر اردو کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے مشاعروں میں بھی مدعو کیے گئے۔

خاص ذرائع کے مطابق حمید الماس بنگلور منتقل ہونے کے بعد پھر کبھی اپنے وطن سگر شریف واپس نہیں گئے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ تساہل پسند طرز زندگی غذا میں بد پرہیزی، اور نظام تنفس میں گڑبڑی کا سبب بنی، جس سے ان کی صحت بری طرح متاثر ہوئی۔ وقفہ وقفہ سے دل کا دورہ پڑنے لگا۔
بالآخر 15 اور 16 جولائی 2002 کی درمیانی شب میں عارضۂ قلب میں مبتلا ہوکر انتقال کر گئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

جہاں سے اٹھ گئے یہ سوچتے ہوئے الماس
ہم اتنی دیر کہاں اور کس کے پاس رہے

ہندوپاک کے ایک ممتاز شاعر کے انتقال پر ادبی و سماجی حلقے میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کرناٹک اور حیدرآباد میں تعزیتی جلسے ہوئے اور اخبارات و رسائل نے خراج عقیدت میں صفحات کے صفحات شائع کیے۔

تصنیفات

حمید الماس نے اپنے ادبی کیریئر میں مختلف اصناف ادب میں عرق ریزی اور محنت شاقہ کے نتیجے میں اردو دنیا کے ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کی۔ لیکن زیادہ تر معریٰ اور آزاد نظم کو وسیلۂ اظہار خیال بنایا۔ غزل پر بھی یکساں قدرت رکھتے

تھے۔لیکن نظم گو شاعر کے طور پر عوام وخواص میں جانے جاتے ہیں۔ان کی جملہ علمی کاوشوں کو کل چار زمروں، شعری تخلیقات، نثری تخلیقات، منظوم تراجم اور نثری تراجم میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اول الذکر زمرہ میں کل چھ شعری مجموعے آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(1) پہچان کا درد: اولین شعری مجموعہ جو 1974 میں شائع ہوا۔(2) جوئے سبز: یہ قومی اور وطنی شاعری پر مشتمل ہے۔اس میں 18 نظمیں اور ریڈیو کے لیے تحریر کردہ غنائیے شامل ہیں۔(3) نقشِ خرابی: یہ واحد مجموعہ ہے جس میں ان کے ایک عدد حمد اور ایک نعت پاک شامل ہے۔اس کے علاوہ 35 نظمیں اور 20 غزلیں ہیں۔سال اشاعت 1983 ہے۔(4) برف، شجر، آواز: یہ مجموعہ 62 نظمیں اور 38 غزلوں پر محیط ہے۔(5) رنگِ تماشہ: یہ منفرد انداز کا شعری مجموعہ ہے۔اس میں تین سطری 200 نظمیں شامل اشاعت ہیں۔(6) آخری ساعت سے پہلے: یہ مجموعہ ان کے منتخب کلام پر مشتمل ہے، جسے خود مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔ان کی پہلی برسی کے موقع پر بطور خراج عقیدت کرناٹک اردو اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

نثری مجموعہ: (1) سر وراہ: کنڑ ادب اور کلچر سے متعلق دس مضامین اور فیچر شامل ہیں۔جس میں کنڑ شاعر، فکشن اور طنز ومزاح کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(2) سے سے: یہ موصوف کے 20 مختصر مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف مذہبی موضوعات، اور ادبی شخصیات پر کنڑ زبان میں آکاش وانی بنگلور کے لیے تحریر کیے گئے تھے۔اس کا سال اشاعت 1984 اور طابع وناشر آئی بی ایچ پرکاشن ہے۔

منظوم تراجم (1) فرمودات: یہ کتاب کنڑ کے صوفی سنت شاعر شری بسویشور کے 108 منتخب وچنوں کا منظوم ترجمہ ہے۔(2) شبِ گرو: یہ کنڑ کے 17 نامور شاعروں کی 45 نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔اس میں جملہ 17 شعرا کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

نثری تراجم: (1) پنجے منگیش راؤ: کنڑ زبان کے قدآور شاعر وادیب پنجے منگیش سے متعلق ہے۔(2) شری بسویشور: کنڑ کے عظیم شاعر، روحانی پیشوا اور سماجی مصلح بسویشور کی حیات پر ہے۔ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی ایما پر اس کا ترجمہ کیا تھا، جو 1990 میں منظر عام پر آئی۔(3) ماستی کی کہانیاں: ماستی وینکٹیس، کنڑ کے عظیم افسانہ نگار، شاعر اور نقاد کی کہانیوں کو اردو کا جامہ پہنایا

ہے۔ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی انعام یافتہ کتاب ہے۔1997 میں شائع ہوئی۔

اعزازات وانعامات

حمید الماس کی قابل رشک ارددخدمات کے اعتراف میں ملک کے کئی باوقار اداروں اور اکیڈمیوں نے انھیں اعزاز واکرام سے نوازا۔ان میں ریاستی سطح کے ادارے بھی ہیں اور قومی سطح کے بھی۔ان کی شہرت ومقبولیت ریاستی سرحد کو بھی پار کر چکی تھی۔یہی وجہ ہے کہ جب 1974 میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام منظرعام پر آیا تو اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انعام کی پیشکش کی۔اس کے علاوہ مختلف موقعوں سے آندھراپردیش اور بہار اکیڈمی نے بھی اس کی پیروی کی۔ان کی زندگی کا اہم ایوارڈ راجیوا تسوما نا جاتا ہے، جو حکومت کرناٹک مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو ریاست کے یوم تاسیس (یکم نومبر) کے موقع پر نوازتی ہے۔ساہتیہ اکیڈمی نے جب 1989 میں 24 زبانوں میں بہترین تراجم کے لیے ایوارڈ کا آغاز کیا تو پہلے ہی سال حمید الماس کی کتاب 'فرمودات' انتخاب میں آئی۔ادبی خدمات کے اعتراف میں ہی 1988 میں شری کیمپے گوڈا ایوارڈ سے نوازے گئے۔مجلس ادب بنگلور کے گولڈن جوبلی کے موقع پر بحیثیت شاعر وادیب ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔حیدرآباد کے ادارے 'سلطان العلوم' نے ان کی شعری ونثری خدمات کے توسط سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لیے 'خواجہ بندہ نوازؒ ایوارڈ' عطا کیا۔اس کے علاوہ مختلف اداروں اور انجمنوں نے بھی انھیں اعزازات پیش کیے،ان میں یونٹس انٹرنیشنل آرگنائزیشن ایوارڈ،سیوا سمیتی ایوارڈ،رگھویندر سوامی میمیل ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور بسوادل ایوارڈ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔آکاشوانی میں نشریات کے تئیں ان کی گراں بہا خدمات کے لیے آکاش وانی نے 1998 میں ایک خصوصی تقریب کے دوران گراں قدر اعزاز سے ان کی عزت افزائی کی۔نئی نسل کو ان کی شعری خدمات سے روشناس کرانے لیے ہائی اسکول، پی یوسی اور گریجویشن تک کی نصابی کتابوں میں ان کا کلام شامل کیا گیا ہے۔مزید یہ کہ گلبرگہ یونیورسٹی سے ان پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔

نمونۂ کلام

نظمیں

(1)

چراغ اور زندگی

بارہا میں نے سوچا ہے ہنگامِ شب
کتنے فیّاض ہیں راستوں کے دیے
اجنبی رہروانِ سبک گام کے
سینکڑوں رازِ دل میں چھپائے ہوئے
جیسے نو خیز ٹہنی گُلوں سے لدی ہوئی
بارِ نکہت سے گردن جھکائے ہوئے

....

وہ زمستاں کی رُت ہو کہ باراں کی رُت
فصلِ گُل ہو کہ برگِ پریشاں کی رُت
میں نے دیکھا انھیں جگمگاتے ہوئے
اپنے سینے کی دولت لٹاتے ہوئے

بارہا میں نے سوچا ہے ہنگامِ شب
زندگی راستے کا دیا تو نہیں
آدمی اس جہاں کا خدا تو نہیں

(2)

جوگیا سے
پیت کیے دکھ ہوئے

ہاں دیوی اب یاد نہیں ہے نام بھلا سا تھا اس کا
تھاہ سمندر کی سی آنکھیں پاگل پاگل کھوئی کھوئی
بن بن جس کی ہوک سے کانپا سانجھ سویرے آٹھ پہر
راتوں کا سناٹا اکثر آپ ہی آپ سلگ اٹھتا تھا
رمتا جوگی بہتا پانی اس کا ٹھور ٹھکانا کیا
آدھی رات کے سونے پن میں کون یہاں اب آئے گا
ٹوٹ گئے ہیں پنکھ ہوا کے کون سندیسہ لائے گا
اب تم اس ویران کھنڈر میں کس سے ملنے آئی ہو
من کا روگ نین کے آنسو ارپن کرنے آئی ہو

(3)

پہچان کا درد
نہیں ہوں احتیاجِ نور کا منکر
مگر مجھ کو
فروغِ روشنی سے خوف آتا ہے
کبھی خود کو سفیرِ نور کہتا تھا

کچھ ایسے راز ہیں سینے میں
جو مظہر ہیں
میری سرخروئی کے
لپکتا ہوں اندھیرے کی طرف پیہم
کہیں یہ روشنی عریاں نہ کردے
کبھی جینے نہ دے گی چین سے
مجھ کو پشیمانی

(4)

سورج کا تعاقب

کبھی افلاک سے نسبت ملی ہے کج کلاہوں کو؟
کبھی میں بھی تمھاری طرح سورج پر لپکتا تھا
مگر اک دن ہوا ایسا
سنہرے رتھ پہ سورج ناگہاں اس سمت سے گذرا
گزرتے رتھ کی زد میں پاؤں میرا کٹ گیا
سورج نے شانِ بے نیازی سے
شکستہ پاؤں کی چابک بنائی
اور گیا ایسا کہ پھر اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا
پھر اس سورج کے پیچھے کیوں چلوں
جس نے شکستہ پا کیا مجھ کو
مبارک ہو تمھیں گرمِ سفر رہنا

(5)

بن باس

ہر اک شئے لگ رہی ہے سہمی سہمی
جھبہ پالو ٹتے پتے
پشیماں برہنہ شاخیں
زمیں کے خشک سینے سے ابھرتے گرسنہ پتھر
لہو پیتی ہوئی راہیں
دعائیں مانگتا پھیلا ہوا بے خواب سناٹا
میں ایسے خشک جنگل میں ہوں تنہا سات برسوں سے
جو آسکتی ہو آ جاؤ ابھی ورنہ
تم اپنے شہر کی ساری ہوائیں اس طرف بھیجو

(6)

غزلیں

چُرا کے میرے طاق سے کتاب کوئی لے گیا
مری تمام عمر کا حساب کوئی لے گیا

یہ واقعہ ہے جب لٹی میرے چمن کی آبرو
لرزتی شاخ رہ گئی گلاب کوئی لے گیا

وہی تو ایک ذریعۂ نجات میرے پاس تھا
مگر مرے ضمیر کا ثواب کوئی لے گیا

مرے بدن میں چُبھ رہی تھیں سوئیاں سی رات بھر
سحر ہوئی تو لُطفِ اضطراب کوئی لے گیا
شفیق و مہرباں زمیں ہے راستہ کھلا ہوا
نہ جانے کب سمیٹ کر سراب کوئی لے گیا
سوال بن کے روبرو کھڑی ہوئی تھی زندگی
سرالہو نچوڑ کر جواب کوئی لے گیا
چھپالیا ہے میں نے سارا درد اپنی روح میں
تسلّیوں کا ظاہری نقاب کوئی لے گیا

☆☆☆

(6)

سرحدِ گُل سے نکل کر ہم جُدا ہو جائیں گے
کل تمھاری قیدِ خوشبو سے رہا ہو جائیں گے
ذہن میں احساسِ رفعت ہی نہ ہوگا شام تک
بڑھتے بڑھتے دن کے لمحے یوں ہوا ہو جائیں گے
چھوڑ جاؤ دامنِ امروز میں بھی کچھ نہ کچھ
ورنہ تم سے طائرِ فردا خفا ہو جائیں گے
سامنے ہے ساعتِ آخر کا ان دیکھا عذاب
عمر بھر کہتے رہے اب بے نوا ہو جائیں گے

☆☆☆

ماخذ

یادِ رفتگاں: حمید الماس : از غضنفر اقبال اطہر احمد
ناشر کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور، سال اشاعت 2009

یہ کتاب ادب، سخنوری اور صحافت کے شعبے سے متعلق ریاست کرناٹک کی سات ادبی شخصیات کے تعارفی خاکوں اور اردو کے تئیں ان کے گراں قدر ادبی کارناموں کا احوال نامہ ہے۔ یہ 2012 میں شائع مصنف کی پہلی کتاب 'فخر کرناٹک شخصیات' کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ زبان کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے کرناٹک ایک زرخیز خطہ ہے جہاں نہ صرف اردو کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا بلکہ وہاں کے باذوق اہل قلم نے اس کے دامن کو وسیع کرنے میں اپنا بھرپور تعاون بھی پیش کیا۔ سخنوری میں سلیمان خطیب اور فکشن تنقید اور افسانہ نگاری میں ممتاز شیریں جیسے فاضل ادبا کا تعلق اسی خطے سے ہے۔ یہ کتاب انھی کے تذکرے پر مبنی ہے۔

کتاب کے مصنف جناب محمد خورشید عالم ایک ریسرچ اسکالر ہیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع: مجاہد آزادی مولانا عبدالرزاق: حیات و خدمات ہے۔ عربی زبان، ترجمہ، تدریس اور اسلامیات کے ساتھ انھیں صحافت سے دلچسپی ہے۔ انگریزی اور اردو کے موقر رسائل اور جرائد میں ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور کے زیر اہتمام 'فخر کرناٹک شخصیات' اور فکر و نظر (عربی مضامین کے اردو ترجمے کا مجموعہ) ان کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ وہ فی الوقت کنٹنٹ انالسٹ (عربی) کی حیثیت سے تھامسن رائٹر کمپنی (بنگلور) سے وابستہ ہیں۔

ISBN 978-93-5160-080-0





قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025

قیمت-/99 روپئے